فکرونظر............ اسلام آباد جلد: ۴۵ شمارہ: ۴

رائج الوقت سیاسی افکار کا تجزیہ
(قرآن حکیم کی روشنی میں)

ڈاکٹر مستفیض احمد علوی☆

ابتدائیہ

سیاسیات بنیادی طور پر، ریاست اور اس سے متعلق امور کا علم ہے۔ اس علم کا نظری پہلو، سیاسی افکار و نظریات کو محیط ہے، جبکہ دوسرا پہلو عملی سیاست سے متعلق ہے۔ ریاست میں کوئی بھی جوہری تبدیلی، خواہ وہ اس کی ہیئت ترکیبی میں ہو یا ہیئت حاکمہ میں، سیاسیات کے پورے نظام کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ریاست کیا ہے؟ ایک ایسا منظّم معاشرہ جس کا اپنا مخصوص علاقہ ہو، جہاں کسی قانون کی عملداری قائم ہو اور اس قانون کی تنفیذ کے لیے اس معاشرے کی اپنی ہیئت حاکمہ یعنی حکومت موجود ہو۔ کسی بھی نظام ریاست کی بنیاد، وہ سیاسی و سماجی افکار ہوتے ہیں جو کسی معاشرے کے افراد کے اذہان میں، تہذیبی طور پر ارتقاء پذیر ہوتے ہیں۔ گویا سیاسیات کے وسیع تناظر میں تبدیلی، معاشرے کے نظام افکار میں تبدیلی کیساتھ منسلک ہے۔

سولہویں صدی عیسوی کے بعد، دیار مغرب میں، کچھ غیر معمولی فکری و عملی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مغرب کی اس نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے دوران میں، قدیم یونانی فلسفے نے، جدید دور کے تقاضوں کو سمو کر، ایک نئی زندگی حاصل کی۔ انسانیت پسندی (Humanism) کے مرکزی خیال نے، انسان کو معیار خیر و شر قرار دیا اور یوں کائنات کا مرکز، خدا کی جگہ بندۂ خدا ٹھہرا۔ انسانی زندگی کو انسانیت کی سطح پر پرکھنے کا طرز فکر پیدا ہوا۔ الٰہی ہدایت کی جگہ انسانی عقل نے لے لی۔ انسان کو صحیح اور غلط کے پرکھنے کا اختیار دیا گیا تو بات ذاتی مفاد سے شروع ہوئی اور قومی مفاد پہ جا کے رک گئی۔ لھذا انسانیت کا اجتماعی مفاد، ثانوی درجے پہ چلا گیا اور اولیت قومی مفاد کو حاصل ہو گئی۔

قوم پرستی کے جنون میں مبتلاء، طاقتور ریاستوں کے نو آبادیاتی رجحان نے ان تبدیلیوں کے اثرات، عالمی سماج میں منتقل کر دیے۔ ان اثرات کے پھولنے پھلنے سے، اکیسویں صدی تک نوبت یہ آگئی ہے کہ اب اکثر ریاستیں، اہل مغرب کے سیاسی فکر وعمل اور معاشی دام و دانہ کی اسیر نظر آتی

☆ صدر شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ خواتین WISH (رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی) اسلام آباد

ہیں۔ عصر حاضر کی سماجی زندگی میں، ریاستی نظام نے وسعت کیساتھ پیچیدہ صورتحال اختیار کر لی ہے۔ سیدھی سادی روایات پر مبنی انسانی تمدن نے، ایک مشینی معاشرے کا روپ دھار لیا ہے۔ سماجی ترقی اور سیاسی ارتقاء کے تصورات کیساتھ، جدید ریاست ایک تیکنیکی ادارہ بن چکی ہے۔ ایسے حالات میں سیاسیات، ایک وسیع سائنس بن گئی ہے جو ایک خاص فلسفے کی پیروکار اور مخصوص اصطلاحات میں منضبط ہے۔ دور جدید میں یہ سارا نظام، جمہوریت کی چھتری تلے سانس لے رہا ہے۔

اٹھارہویں صدی تک ناپسندیدہ سمجھا جانے والا طرز حکومت...... جمہوریت، اب ایک آفاقی مذہب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ سیاست اور جمہوریت کے نئے پہلو دریافت کیے گئے ہیں۔ ریاست کے آغاز و ارتقاء کی کہانی اور اقتدار اعلیٰ کے سرچشمے تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ آئین کے مآخذ اور مذہب کے تہذیبی کردار میں بنیادی تبدیلی لائی گئی ہے۔ تہذیب و تمدن کا یہ سارا خواب، بنیادی طور پر مغربی معاشروں میں شرمندۂ تعبیر ہوا ہے، مگر خواہے نخواہے، امت مسلمہ اس کے اثرات کی زد میں ہے۔ امت کے دانشور کے سامنے اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جدید سماجی افکار و اقدار میں سے کس کو قبول کیا جائے اور کس کو مسترد۔ عامۃ المسلمین کی اکثریت بھی اسی الجھاؤ کا شکار ہے۔ ایک طبقہ، مکمل اور مطلق قبولیت کو وقت کا فیصلہ سمجھتا ہے اور دوسرا طبقہ، مکمل استرداد کو، تقدیر کا لکھا تسلیم کرتا ہے۔

راقم السطور کی نظر میں، امت مسلمہ کی اجتہادی بصیرت کے لیے، یہ سوال بہت اہم ہے۔ ایک محقق کو، تجزیے کی نظر سے، اس وقت دیکھنا یہ ہے کہ جمہوری فکر و عمل کے مختلف پہلو، اسلام کی آفاقی تعلیمات سے کس درجہ مطابقت رکھتے ہیں اور کہاں کہاں انسانی فکر اپنی نارسائی کے ثبوت پیش کررہی ہے۔ اسی جستجو کیساتھ، ذیل میں ایک تحقیقی تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں، دور حاضر کی اہم سیاسی اصطلاحات...... جو کہ مخصوص فکری پس منظر لیے ہوئے ہیں...... کا محاکمہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ مقصد یہ پیش نظر ہے کہ اہل علم کی توجہ اس موضوع کی جانب مبذول کروائی جائے تاکہ وہ اپنی اجتہادی بصیرت کو بروئے کار لائیں اور اس ابتدائی نوعیت کے کام کو وسعت گہرائی سے آشنا کریں۔

سیاست اور جمہوریت (Politics & Democracy)

عربی زبان میں لفظ سیاست، سوس سے ماخوذ ہے جس کے معنی اصلاح کرنے، سنوارنے اور نگرانی و انتظام کرنے کے ہیں۔(۱) اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے سیاسة کا معنیٰ تدبیر ریاست اور

ملک و قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے کام کرنا ہے۔ انسانی معاشرے میں اجتماعی امور کی تنظیم کے لیے اپنا حصہ ادا کرنا اور اس مقصد کی خاطر، ریاست میں اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد بھی سیاست کہلاتی ہے ۔

قرآن میں لفظ سیاست مذکور نہیں۔ غور و خوض کرنے سے معلوم ہو گا کہ تدبیر ریاست کے لیے قرآن کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ زمینی اقتدار اور حاکمیت کوالفاظ قرآنی میں کئی مقامات پر **تمکن فی الارض**، **استخلاف فی الارض** اور **تحکم بین الناس** کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور، پردرج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

۱. **الذین إن مّکّنّٰهم فی الارض أقاموا الصلوٰة.....الآیة**

۲. **وعداللّٰه الذین امنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنهم فی الارض.....الآیه**

۳. **إن اللّٰه یأمرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الیٰ اهلها واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل .(۲)**

ان آیات میں انسانی معاشرت کی اجتماعی تنظیم، اس کی اصلاح، حکومت کے نظام اور عدل گستری کے آداب کا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ انہی اصولوں کو آج کے دور میں سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم بنظر عمیق دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن حکیم زمینی اقتدار کو، شریعت الٰہی، ایمان، عمل صالح اور عدل بین الناس کیساتھ منسلک کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر امام غزالی، اسلامی سیاست کو **استصلاح الخلق** یعنی مخلوق کی اصلاح کا کام، قرار دیتے ہیں اور علامہ ابن خلدون نے اسے **کفالة للخلق و خلافة اللّٰه** یعنی مخلوق کی سرپرستی اور اللہ کی نیابت سے موسوم کیا ہے۔(۳) گویا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاست اس تدبر اور حکمت عملی کا نام ہے جو انسانی معاشرے کو منظّم کرنے، اس کی اصلاح کرنے اور نیابت الٰہی میں، ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لیے درکار ہے۔

عربی کے لفظ سیاست کے مقابلے میں، انگریزی لفظ Politics استعمال ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح یونانی زبان کے *Polis* سے لی گئی ہے جو کہ قدیم یونان میں، شہری ریاست کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسی بنیاد پر ارسطو نے اسے اپنی مشہور کتاب کے نام کے لیے منتخب کیا اور اس کے بعد سے پالیٹکس کا لفظ، ریاست و حکومت کے علم وفن کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اسی مفہوم کے تحت، اب یہ لفظ، تدبیر ریاست اورفنِ حاکمیت کے لیے مستعمل ہے۔

جدید ریاست کے چار عناصر مانے گئے ہیں: علاقہ، آبادی، حکومت اور اقتداراعلیٰ۔ سیاست کے

وسیع مفہوم میں ریاست اور اس میں قائم حکومت کے، تما م امور شامل ہو جاتے ہیں اور اس طرح انسان کی اجتماعی زندگی کے سبھی دائروں سے اس کا تعلق مربوط ہو گیا ہے۔ ماہر سیاسیات، سالٹاؤ (Soltau) کے مطابق یہ لفظ اجتماعی ذمہ داری کے تصور اور احساس کے ساتھ وابستہ ہے:

Politics is the concern of everybody with any sense of resposibility.(۴)

اس تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیاسیات کا، قرآن سے ماخوذ تصور، رائج الوقت تصور سیاست میںاضافہ و ترمیم کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تدبیر ریاست کے علم وفن میں، الٰہی قانون کی تنفیذ اور عدل اجتماعی کا قیام، ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل ہونا چاہیے۔ یہ بات واضح ہو گئی ہے تو ہم جمہوریت اور اس کے فلسفے کے تجزیے کی طرف بڑھتے ہیں۔

جمہوریت بنیادی طور پر سیاست کے ایک حصے، یعنی حکومت کی تنظیم اور طریق کار سے منسلک ہے۔ اردو زبان میں، عربی کا یہ لفظ، انگریزی کی اصطلاح ڈیماکریسی کے متبادل کے طور پر مقبول ہوا ہے۔ عربی لغت کے ماہرین کی آراء سے واضح ہوتا ہے کہ جمہوریت، لفظ **جمہور** سے بنا ہے جس کا بنیادی مادہ **جمھر** بتایا گیا ہے اور اس کا معنی ٰکسی شئی کا مجموعہ ہے۔ لسان العرب کے مصنف، اس لغوی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لفظ جب قوم کے ساتھ آئے تو اس سے مراد اس قوم کی اکثریت ہوتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

جمهرت القوم: اذا جمعتهم ......، جمهرت الشيء اذا جمعته۔

اسی طرح مرتضٰی زبیدی لکھتے ہیں:

و جمهر ، أي الشيء : جمعه...... و الجمهور: معظم كل شيء۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ الجمھور کا بنیادی مفہوم کسی چیز کااکثریت میں پایا جانا اور اس کا دوسری چیزوں سے ممتاز اور نمایاں ہونا ہے۔ جمہور کا لفظ انسانوں کے لئے آئے تو اس سے ان کی اکثریت یا ممتاز اکثریت مراد ہوتی ہے ۔ جیسا کہ علمائے لغت نے بیان کیا ہے۔مرتضٰی زبیدی کے الفاظ میں اس کا خلاصہ یوں بنتا ہے:

و الجمهور من الناس: جلهم و أشرافهم۔ و هذا قول الجمهور۔(۵)

گویا جمہوریت کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں اکثریت اور نمایاں یا نمایاں اکثریت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ مغربی سیاسیات کی یہ اصطلاح، ایسے طرزِ حکومت کے لئے بولی جاتی ہے جس میں کسی ریاست کی حکومت، رعایا کی اکثریت کی مرضی کے تابع ہو۔ انگریزی میں ڈیموکریسی Democracy کا لفظ، یونانی زبان کے دو الفاظ DEMOS اور KRATOS سے مل کر بنا ہے اور لغوی مفہوم کے لحاظ سے 'لوگوں کی حاکمیت' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ڈیوڈ ہیلڈ اور دیگر ماہرین سیاسیات نے لکھا ہے: (۶)

> The word ' democracy ' came in to English in the sixteenth century from the
> French demokratie, its origins are Greek; 'Democracy' is derived from demokratia,
> the root meanings of which are demos(people) and kratos(rule). Democracy
> means form of government in which in contradiction to monarchies and
> aristocracies, the people rule.

(لفظ 'جمہوریت' انگریزی زبان میں سولھویں صدی عیسوی میں فرانسیسی سے آیا ہے جب کہ یہ اپنی اصل کے لحاظ سے یونانی زبان کے الفاظ 'ڈیماس' (یعنی لوگ) اور 'کراتوس' (یعنی حاکمیت) سے ماخوذ ہے۔ گویا جمہوریت سے مراد ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں بادشاہت اور اشرافیہ کے بالعکس، لوگ خود حاکم ہوں۔)

جمہوریت اسی وقت عمل میں آتی ہے جب عوام الناس کی اکثریت بالواسطہ طور پر یا براہِ راست، ریاستی اقتدار میں شریک ہو۔ جیسا کہ ایک ماہر سیاسیات کہتا ہے:

> A complete democracy would consult all of its citizens upon all matters...It gives citizens not merely the sense of sharing in decisions, but the actual opportunity to influence its substance.(7)

'ایک مکمل جمہوریت تمام معاملات میں تمام شہریوں کے مشورہ سے چلتی ہے۔ یہ اپنے

شہریوں کو نہ صرف، اجتماعی فیصلوں میں شرکت کا احساس دیتی ہے بلکہ انہیں ان فیصلوں کی حقیقت پر اثر انداز ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔'

اسی بنیاد پر قدیم و جدید سیاسی مفکرین نے اسے عوام کی حاکمیت Rule of People یعنی عوام الناس کی مرضی کے تابع حکومت قرار دیا ہے۔(۸) اس کی عملی شکل یہ ہوتی ہے کہ عام انتخابات کے ذریعے عوام الناس کی اکثریت کی رائے معلوم کی جاتی ہے اور ان کی خواہشات کے مطابق نہ صرف حکومت بنتی ہے بلکہ وہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ یہ حکومت، لوگوں کی اکثریت کے منتخب کردہ ایوان یعنی پارلیمنٹ Parliament کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے اور عوام کی خواہشات کے خلاف کام کرنے کی صورت میں اسے سبکدوش ہونا پڑتا ہے۔ ضروری ہے۔ گویا ایک جمہوری طرز حکومت میں، قوم کے تمام اجتماعی فیصلے عوام الناس کی خواہشات کے مطابق اور ان کی مرضی کے تابع ہونا ضروری ہیں۔

قرآن و سنت اور اسلامی تاریخ سے، جمہوریت کے اس تصور کے حق میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ قرآن نے اکثریت کی حکمرانی کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اکثریت کے بے سوچ سمجھے رویے کو، بطور اصول تمدن اپنانے سے، سختی سے روک دیا ہے۔ قرآن میں واضح حکم یوں آتا ہے:

ا. وان تطع اکثرمن فی الارض یضلّوك عن سبیل اللّٰه ان یّتبعون الا الظن وان هم الا یخرصون.(۹)

'اور اے محمد ﷺ! اگر آپ زمین کے باسیوں کی اکثریت کی مانیں تو یہ آپ کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔'

اس ہدایت ربانی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اجتماعی معاملات کو اگر لوگوں کی خواہشات کے حوالے کر دیاجائے تو انسانیت، تعمیر کی بجائے تخریب کے راستے پہ چل نکلتی ہے۔ ایسی قومیں جو اکثریت کی منفی سرگرمیوں کو روکتی نہیں ہیں اور ایسے رویے ہی ان کے اجتماعی اخلاق کی علامت بن جاتے ہیں تو اللہ کی ناراضگی، عذاب کی صورت میں ان پر نازل ہو جاتی ہے۔ قرآن نے قدیم انسانی معاشروں کا ذکر، ایسے قومی گناہوں اور جرائم کی مذمت کے ساتھ کیا ہے لہذا عوام الناس یا اکثریت کی ایسی قیادت اور حاکمیت مکروہ قرار دے دی ہے، جو شعور اور الٰہی ہدایت سے بے بہرہ اور خواہشات انسانی سے لبریز ہو۔(۱۰)

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے حکمرانوں، بادشاہوں اور سربراہوں کا ذکر، صیغۂ

واحد میں **خلیفہ**، **امام**، **ملک** اور **حکم**...... کے الفاظ کے ساتھ کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں اکثریت کی حکمرانی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے ماضی کے حکمرانوں کے تذکرے میں اچھے بادشاہوں اور ان کی اعلیٰ کارگردگی پر تبصرہ بھی فرمایا ہے جیسے کہ ذوالقرنین، طالوت اور ملکہ سبا(۱۱) کے ذکر سے ظاہر ہے۔ لیکن جمہور کی کسی مثالی فرمانروائی کا کوئی حوالہ، اس کتاب محفوظ میں موجود نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ قرآن، ملوکیت یا بادشاہت کے نظام حکومت کو مثالی طرز حکومت قرار دیتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ خیال درست نہیں۔ قرآن میں بادشاہوں کاذکر ایک تاریخی حقیقت کے طور پر آیا ہے اور اچھے بادشاہوں کی تحسین سے، دراصل، یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن ایسی حکمرانی کا مجوز اورمؤید ہے جو خدا ترسی اور انصاف پر مبنی ہو...... بھلے وہ ایک حاکم کی شکل میں ہو یا قوم کے بڑوں کی کسی جماعت کی شکل میں۔

اس بات کا ثبوت وہ قرآنی آیات ہیں جو، ظالم اور برے حکمرانوں کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں ۔(۱۲)

اس تجزیے سے جو بات، ایک سیاسی اصول کے طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم، حکمرانی کے کسی ایک ماڈل کو آئیڈیل یا لازم قرار نہیں دیتا اور یہ اس کے ابدی اور آفاقی ہونے کا ایک مظہر بھی ہے کیونکہ ماڈل Model اور سسٹم System زمان و مکان کی حدود کے پابند ہیں۔ ان کی شکلیں زمانے کے حالات اور سیاسی و سماجی تبدیلیوں کیساتھ تبدیل ہو سکتی ہیں۔ لھذا طرز حکومت جو بھی اپنایا جائے، پیمانہ یہ ہے کہ، انسانوں پر حکمرانی، خدا خوفی، انصاف اور انسانیت کی بھلائی پر مبنی ہونی چاہیے۔

جمہوریت کے حقیقی مفہوم کو سامنے رکھیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس سیاسی فکر کے علمبردار، عوام الناس کو، حاکمیت یا اقتدار کا اصل مالک تصور کرتے ہیں۔ (آگے جا کے اس کی مزید وضاحت ہو گی) ظاہر ہے یہ تصور قرآنی تعلیمات کے صریحاً منافی ہے۔ قرآن پاک نے **لله ملك السمٰوٰت والارض** کہہ کر حاکمیت اعلیٰ کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دیا ہے اور زمین میں، بنی آدم کو جو اختیار و تصرف حاصل ہے اسکو، لفظ **خلیفہ** میں سمو دیا ہے۔ چنانچہ انسانی تخلیق اور بعثت کے تذکرے میں ارشاد ہوتا ہے:

و اذ قال ربك للملئكة انى جاعلٌ فى الارض خليفة......

یہاں خلیفہ کا لفظ، انسان کے لئے متعین مقام، نیابت، نمائندگی اور انسان کے عز و شرف پر

دلالت کرتا ہے۔ جس سے خود بخود یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اقتدار کا مالک نہیں، امین ہے۔ یہ حاکمیت اس کی ملکیت نہیں بلکہ اصل مالک کی عطاء ہے جو ایک خاص مہلتِ عمل تک کے لئے ہے:

ولکم فی الارض مستقرٌ وّمتاعٌ الی حین۔(۱۳)

لہٰذا اسلامی طرزِسیاست میں، مروجہ جمہوریت کے بالمقابل، خلافت کا اصول کار فرما ہے۔ اسلامی حکومت میں لوگوں کی رضامندی کا دخل ضرور ہے اور اس کی عملی شکل 'بیعۃ' کا ادارہ ہے جس کے تحت عوام کی رضامندی ایک مقصد کی خاطر، صاحب امر کے انتخاب میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے، مگر یہ حکومت لوگوں کی اکثریت کی خواہشات کے تابع ہوکر نہیں چلتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ پیغمبر خدا داؤد علیہ السلام کی حکومت کے ذکر میں، قرآن نے یہ بنیادی اصول واضح کر دیا ہے کہ اسلامی حکومت لوگوں کے درمیان انصاف کے قیام کے لیے وجود میں آتی ہے اور اس میں نفسانی خواہشات سے گریز، ناگزیر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

یٰداوٗد انا جعلنٰك خلیفةً فی الارض فاحکم بین النّاس بالحق ولا تتبع الھویٰ ......(۱۴)

'اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے، پس آپ لوگوں کے درمیان سچائی کا فیصلہ کیجئے اورنفسانی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔'

ریاست اوراقتدار اعلیٰ (State & Sovereignty)

عربی زبان میں ریاسۃ، انگریزی زبان کے لفظ **STATE** کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ریاست 'راس' سے ماخوذ ہے جس کے معنی 'سر' اور 'اصل' کے ہیں۔(۱۵) انگریزی لفظ **State** کی لغوی تشریح کے لیے ہم ایک انگریز مصنف کی تحقیق کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفاء کریں گے۔ وہ لکھتا ہے:

From Latin root 'stare' -meaning to stand or status- the word 'state' became 'estate' in German, 'staat' in old French and in English 'state'.Both the terms state and estate carry the factor of land or territory as common in their meaning ;and both have descended from the old feudal system- the fundamental to the political structure of that time. (16)

گویا سٹیٹ کا لفظ انگریزی زبان میں لاطینی سے آیا، جس کا معنیٰ قیام یا مقام تھا۔ یہ لفظ جرمن

اور فرانسیسی زبان سے ہوتا ہوا انگریزی میں اپنی موجودہ شکل میں وارد ہوا ہے، اور اپنے دامن میں ایسے خطۂ زمین یا مخصوص علاقے کا مفہوم لیے ہوئے ہے جو قدیم جاگیردارانہ نظام سیاست کا بنیادی خاصّہ تھا۔

ریاست کا جدید تصور ایک منظّم اجتماعیت کا ہے۔ کسی خاص علاقہ میں موجود انسانوں کا ایک ایسا معاشرہ جس کے اختیارات حاکمیت، افراد کے ایک گروہ یعنی حکومت کے پاس ہوں اور وہ اس معاشرے کے اندر اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔

ریاست کا ادارہ دراصل انسانی اجتماعیت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ قدیم انسان کے رہن سہن، ضروریات زندگی اور آپس کے تعلقات کے نتیجے میں معاشرے جنم لیتے رہے جو آہستہ آہستہ ارتقاء پذیر ہوئے اور منظّم ریاست کی شکل اختیار کر گئے۔ سیاست کے جدید ماہرین کی رائے کے مطابق ریاست کے بنیادی عناصر چار ہیں: علاقہ، آبادی، حکومت اور اقتدار اعلیٰ۔ ان اجزاء کے بغیر کسی اجتماع انسانی کو ریاست نہیں کہا جاسکتا۔

ریاست کے آغاز اور ارتقاء کے سلسلہ میں ماہرین سیاسیات میں دو آراء زیادہ مقبول ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاست کی تخلیق خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر انسان کے ہاتھوں ہوئی۔ اولاد آدم نے انتظامی اختیارات اپنے بڑوں کو دیے اور یوں بادشاہت و حاکمیت کا نظام قائم ہوتا چلا گیا۔ اس نظریہ کی تفصیل رابرٹ فلمر Robert Filmer کی کتاب Patriarch میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ماضی میں عیسائی مفکرین کی اکثریت کا عقیدہ تھا کہ خدا نے انسان کے نظم اجتماعی کے لیے ریاست بنائی ہے۔ یہ نظریہ تخلیق ربانی (Divine Theory of Origin of State) کہلاتا تھا۔ دوسرا نقطۂ نظر اٹھارہویں صدی میں مقبول ہوا، جس کے مطابق ریاست کا ادارہ، قدیم انسانی گروہوں کے درمیان طے پانے والے، بقائے باہمی کے ایک ''معاہدہ عمرانی'' کے تحت قائم ہوا۔ اس نظریے کی تفصیل تھامس ہوبز Thomas Hobbes (کتاب:The Leviathan)، جان لاک John Locke (کتاب: Two Treaties of Government) اور روسو Roussea(کتاب:Social Contract) کے ہاں ملتی ہے۔

جدید جمہوری فکر میں ریاست کو، انسان کا تخلیق کیا ہوا ایک ادارہ گردانا گیا ہے جو انسانی معاہدہ عمرانی (Social Contract) کے تحت معرض وجود میں آیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان نے ریاست، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تشکیل دی ہے لہذا اس پر حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ

(Sovereignty) کا اختیار بھی انسان ہی کو حاصل ہے۔

یورپ میں سولہویں صدی عیسوی کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) اور تحریک اصلاح (Reformation Movement) کے نتیجے میں، سلطنت روما والا مذہب و ریاست کا اتحاد دم توڑ گیا اور اس طرح ریاست پر چرچ یعنی مذہب کی برتری ختم ہو گئی۔ اسی طرح ریاست کے لیے تخلیق ربانی کا تصور بھی مدھم پڑ گیا۔ ایسی صورتحال میں ریاستوں اور معاشروں پر کسی ایسی برتر قوت کی ضرورت کا احساس بڑھ گیا جس سے نظم اور استحکام پیدا ہو۔ کسی ایسے اقتدار کی تلاش شروع ہوئی جس کے تحت افراد اور ادارے وفاداری کے تصور کیساتھ منسلک ہوں اور ریاست میں امن و سکون کی فضا، کسی برتر طاقت کے سامنے، جوابدہی کے احساس کے ذریعے پیدا کی جا سکے۔

اس ضرورت کو مذہب کے قدرتی ادارے کے ذریعے پورا کرنے کی بجائے، سیاسی ماہرین (خصوصاً Protestants) نے مصنوعی طریقے سے، ایک سیاسی فلسفہ کے ذریعے سے پورا کیا۔ وہ اس طرح کہ بائیبل Bible میں مذکور 'مقدس عہد' یعنی Covenant یا 'عہد خداوندی' سے، معاہدہ عمرانی کا تصور مستعار لیا۔ تاہم اس کی تعبیر میں سے خدا کو الگ کر کے اس کی غیر مذہبی Secular تشریح کی گئی اور یوں اس عہد کو خدا اور انسانوں کی بجائے صرف انسانوں کے مابین معاہدہ قرار دیا گیا، جسے Social Contract کے نام سے، ایک سیاسی نظریے کے طور پر پیش کر دیا گیا۔ اس سماجی معاہدے کا مفہوم یہ طے پایا کہ ریاست میں اصل اختیار حاکمیت، عوام کی ملکیت ہے جسے وہ ایک معاہدے کے تحت اپنی قائم کردہ حکومت کو سونپتے ہیں جو اس اختیار کا استعمال عوام ہی کی مرضی کے مطابق کرتی ہے۔ یہ اختیار حاکمیت، اقتدار اعلیٰ یا Sovereignty کہلایا اور اس کے مرکز و محور کو 'ساورن' Sovereign کہا گیا۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں اس لفظ کی تشریح یہ کی گئی ہے:

> Originally, as derived from the Latin term *su pera* nus through the
> French term souveraineté,
> sovereignty was meant to be the equivalent of supreme power.

سولہویں صدی کے فرانسیسی مفکر ژین بودین (Jean Bodin) نے جدید تصور اقتدار اعلیٰ کو پروان چڑھایا، جب وہ فرانس کے بادشاہ کا اقتدار جاگیرداروں پر ثابت اور نافذ کرنا چاہتا تھا۔ اقتدار اعلیٰ کے فلسفہ کو مزید مؤثر تشریح اور عملی شکل، امریکہ کے اعلان آزادی (۱۷۷۶ء) اور پھر انقلاب

فرانس (۱۷۸۹ء) کے بعد فرانسیسی آئین (۱۷۹۱ء) کے ذریعے عطا ہوئی۔ اس کے خواص مستقل طور پر یہ طے کردیے گئے، جو آج تک ہر صورت میں مانے اور منوائے جاتے ہیں:

Sovereignty is one, indivisible, unalienable and imprescriptible; it belongs to the Nation; no group can attribute sovereignty to itself nor can an individual arrogate it to himself.

'اقتدار اعلیٰ یکتا ہوتا ہے، ناقابل تقسیم، ناقابل انتقال اور اٹل۔ یہ قوم کی ملکیت ہے؛ کوئی فرد اس کو اپنے نام کرسکتا ہے نا کوئی گروہ اسے اپنے ساتھ منسوب کرسکتا ہے۔'

یہ ہے مغرب میں ریاست اور اسکے اقتدار اعلیٰ کا تصور اور اسکے ارتقاء کی کہانی، جو انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا سے پڑھی جاسکتی ہے...... جمہوری طرز عمل کے اس پہلو کا فکری پس منظر یہ تصور ہے کہ انسان خود ہی معیار خیر و شر ہے۔ یعنی یہ کہ وہ خود یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ صحیح اور غلط، مفید اور مضر...... حتیٰ کہ جائز اور ناجائز کیا ہے۔ یہ تصور دراصل قدیم یونان کے سوفسطائی فلاسفہ نے پیش کیا تھا کہ: 'آدمی ہر چیز کا پیمانہ ہے، چیزوں کی اصل وہی ہوتی ہے جیسی وہ کسی انسان کی نظر میں ہوتی ہیں۔'

Man is the measure of all things.... things are for each man what they seem to each man.(17)

سولہویں صدی عیسوی میں،جب یونانی افکار کا مغرب میں احیاء ہوا تو یہی فلسفہ ،یورپی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کا روحِ رواں بنا۔ نشأۃ ثانیہ کا مرکزی نقطہ 'انسانیت پسندی' یا 'انسانیت پرستی' Humanism تھا۔ جس سے اس سوچ نے فروغ پایا کہ انسان کو اپنے بنیادی فیصلے خود کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیے، اس سلسلہ میں پوپ یا بادشاہ کا کوئی کردار تسلیم نہیں۔ اس فلسفے نے کائنات میں انسان کے وجود اور اسکے مقام کا نئے سرے سے تعین کیا اور کائنات کی حقیقتوں سے، اسکے رشتوں کی تشریح ازسرنو کی گئی۔ اس کہانی کا خلاصہ ایڈورڈ میکسینی (Edward Mccheseny) نے یوں بیان کیا ہے:

For the renaissance, on the other hand, man is more important than God, and man's relations to his fellows more important than his soul's relation to the deity.(18)

'نشأۃ ثانیہ کے سائے میں، انسان خدا کے مقابلے میں زیادہ اہم قرار پایا اور آدمی کے اپنے

ہم جنسوں سے تعلقات زیادہ اہم ہو گئے بہ نسبت اسکے، خدا کیساتھ روحانی تعلق کے۔'

مغرب کی نشأۃ ثانیہ دراصل اسی تصور کے ارتقاء ہی کا دوسرا نام تھا۔ اس فلسفے کی عملی صورت، سیاسی و سماجی میدان میں، جمہوریت کے روپ میں ظاہر ہوئی اور اس کا بنیادی فلسفہ یہ طے پایا کہ کسی ماورآئی طاقت کی بجائے، اقتدار اعلیٰ کے اصل مالک عوام ہیں۔ ریاست کا وجود اسکے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے نہیں کہ وہ عوام الناس کے حق اقتدار کو عملی شکل دینے کا ذریعہ بنے۔

جدید ریاست کے اس مقصد وحید کو سالٹاؤ (Soltau) نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

> The state is only there to give individuals their fullest opportunity of living a good life, they , not the state , being the judge of what goodness, is for them. And finally , the authority cannot come from above or from outside, it's only source is the people themselves.(19)

'ریاست کا وجود صرف اس لیے ہے کہ وہ شہریوں کو ایک اچھی زندگی کے مواقع فراہم کرے۔ اچھی اور بری زندگی کا فیصلہ لوگوں کے ہاتھ میں ہے..... نا کہ ریاست کے پاس اور پھر آخری نقطہ یہ ہے کہ حاکمیت کا اختیار کہیں اوپر یا باہر سے نہیں آسکتا اس کا مرکز و محور لوگ خود ہوتے ہیں کوئی اور نہیں۔'

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ الٰہی قانون کی رو سے یہ تصور درست نہیں۔ دراصل، حاکمیت اعلیٰ کا اختیار اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ہے، انسان کا نہیں:

> **ان الحکم الّا للّٰہ امرالاّ تعبدوا الا ایاہ ذٰلک الدین القیم ولکن اکثرالناس لا یعلمون.(۲۰)**

> 'حکم نہیں ہے کسی کا سوائے اللہ کے۔ اس نے فرما دیا ہے کہ بندگی نہ کرو مگر اسی کی یہی ہے راستہ سیدھا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'۔

اس اعلان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حقیقت نہ صرف یہ ہے کہ حاکمیت انسان کی نہیں ہے بلکہ انسان کا اس دنیا میں صرف یہ کردار ہے کہ وہ اللہ کا عبد اور محکوم بن کے رہے۔ قرآن نے خصوصاً انسان کے اس عمومی رویے کا ذکر (پہلی ہی سورۃ میں) کیا ہے جو وہ اپنی اس حیثیت کو بھلا

کر، دنیاوی وسائل کی بنا پر، اختیار کر لیا کرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اس نے ایک دن اپنے خالق کے سامنے پیش ہو کر جوابدہ ہونا ہے:

کلا ان الانسان لیطغیٰ o أن رّاٰہ استغنیٰ o ان الی ربك الرّجعیٰ o (۲۱)

'ہرگز نہیں بلکہ (اس) انسان نے بغاوت کی، اپنے آپ کو بے نیاز سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے!'

ان آیات میں طغیٰ کا لفظ بہت معنی خیز ہے جس کا مفہوم، حد اعتدال سے نکل جانا ہے۔ اسی سے **طاغوت** کا لفظ ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جس ہستی کی حاکمیت تسلیم کی جائے، اسے قرآن طاغوت قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق انبیاء کی بعثت، انسان کو اسی راستے کی طرف، یعنی طاغوت سے انکار اور اللہ کی حاکمیت پر ایمان لانے کی ہدایت کے لئے ہوئی ہے:

و لقد بعثنا في کل امة رسولا أن اعبدوا الله و اجتنبوا الطاغوت...... (۲۲)

'اور تاکید ہم نے ہر امت میں رسول مبعوث کیے تاکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر لیں اور طاغوت سے اجتناب کی راہ اختیار کر لیں۔'

گویا اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انسان کا، اقتدار اعلیٰ کا مالک بننا، طاغوت کے مترادف ہوناہے جو کہ اسلامی اصول سیاست کے خلاف ہے۔اسلامی حاکمیت کا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و اقتداراعلیٰ پر ایمان لاتے ہوئے، حکومتی ذمہ داری اور اختیار کو ایک امانت سمجھا اور مانا جائے۔ اس کی ادائیگی میں عوام یا رعایا کی رضا مندی، مفاد اور فلاح کو پیش نظر رکھا جائے، بجائے اس کے کہ اللہ کے مقابلے میں انسانی اجتماعیت اور اس کی خواہشات کو بھی حاکمیت اعلیٰ کا درجہ دے دیا جائے۔ اسی اصول کی بنیاد پراسلامی ریاست و حکومت معرض وجودمیں آتی اور قائم رکھی جاتی ہے۔

کسی خاص قوم کی ملکیت اور کسی اقتدار کے ماتحت ایک خاص خطۂ زمین کو، جسے ہم ریاست کہتے ہیں، قرآن 'ارض' کے نام سے موسوم کرتاہے، جیساکہ سورۃ الشعراء میں ذیل کی مثال:
یرید ان یخرجکم من ارضکم بسحرہ فماذا تأمرون.

حاکمیت اوراقتدار کے لئے کہیں **حکم** اور امر کے الفاظ اور کہیں **سلطان** اور **ملك** کے الفاظ آئے ہیں۔ لفظ **سلطان** اور **ملك** میں تو ریاست اور اس کے اقتدار اعلیٰ کا مفہوم، بیک وقت شامل ہے، جسے ہرحال میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت، قرآن کریم کی کئی آیات سے واضح ہے، مثال کے طور پہ ملاحظہ ہوں درج ذیل آیات:

۱۔ له ملك السمٰوٰت و الأرض ۔ 'اسی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا اقتدار'۔

۲۔ ألا له الخلق و الأمر ۔'خبردار! اسی نے پیدا کیا اور اسی کا حق ہے حکم دینا'۔

۳. تبارك الذي بيده الملك و هو علیٰ کل شئ قدير.

'با برکت ہے وہ ذات، جس کے ہاتھ میں اقتدار و حاکمیت ہے اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے'۔

۴. ...... و اجعل لي من لدنك سلطانا نصيراً.

'اور اپنے ہاں سے ایک ریاست و اقتدار کو میرا مددگار اور سازگار بنا دے'

۵. قل اللّٰهم ملك الملك تؤتي الملك من تشآء و تنزع الملك ممّن تشآء..(۲۳)

'کہہ دیجئے کہ اے پروردگار تو ہی اقتدار (ریاست) کا اصل مالک ہے۔ تو جسے چاہے سلطنت عطا کر دے اور جس سے چاہے واپس لے لے'۔

قرآن مجید نے یہاں یہ حقیقت واضح کر دی کہ انسان، خالق نہیں مخلوق ہے اور مالک نہیں، نائب اور امین ہے۔ اسی لیے زمین کے محدود اختیارات میں انسانوں کو اللہ کی طرف سے خلیفہ بنایا جاتا ہے:

۱. و هو الذي جعلكم خلٰٓئف الأرض......

'اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے'

۲. هو الذي جعلكم خلٰٓئف في الأرض فمن كفر فعليه كفره..(۲۴)

'وہی اللہ ہے جس نے تمہیں زمین پر خلافت بخشی ہے۔ پس اس سے جو منہ موڑے اسی پر ہے اس انکار کی ذمہ داری!'۔

مفسرین قرآن کی تشریحات کے مطابق، درج بالا آیات اور دیگر مقامات پر لفظ خلیفہ، قرآن مجید میں نائب، نمائندے یا قائم مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پہ ملاحظہ ہوں درج ذیل آراء:

ابن جریر الطبری لکھتے ہیں:

الخليفة، الفعلية، من قولك : خلف فلان فلانا في هذاالأمر اذا قام مقامه فيه بعده ۔

علامہ ابن الجوزی کے بقول : هو القائم مقام غيره۔

اسی طرح علامہ زمخشری اور امام رازی لکھتے ہیں: من یخلف غیرہ...... و یقوم مقامہ۔(۲۵)

انسان کو اللہ نے، خلافت کا یہ رتبہ، بطور عز و شرف عطا کیا ہے اور اسے زمین پر کچھ اختیارات سے نوازا ہے۔ اس کے لیے اب صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ مالک الملک کی ہدایات کے مطابق زمینی اقتدار کا استعمال کرے۔ اسی بنیاد پر مولانا مودودی لفظ خلیفہ کی تشریح یوں کرتے ہیں:

خلیفہ وہ ہے جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے، خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اس کے اختیارات اصل مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کرکے اس کے منشاء کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

دوسری جگہ (سورہ احزاب کی آیت :۷۲ کی روشنی میں) انہوں نے خلافت اور خلیفہ کے الفاظ کا جامع مفہوم یوں بیان کیا ہے:

خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے اور یہ دونوں لفظ نظامِ عالم میں انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ ہے (Delegated) لہٰذا اللہ نے اس کے اختیارات مفوضہ (Delegated Power) کو امانت سے تعبیر کیا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیاراتِ مفوضہ کو استعمال کرتا ہے، اسے خلیفہ (Vicegerent) کہا ہے۔ اس تشریح کے مطابق خلیفہ کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔(۲۶)

آئین اورمذہب (Religion & Constitution)

ریاست و حکومت کے قوائد و ضوابط ،جو تحریری شکل میں موجود ہوں یا روایات کی صورت معلوم و معروف،آئین و دستور یا Constitution کہلاتے ہیں۔ لغوی معنوں کے لحاظ سے بھی اس لفظ سے مراد 'قیام و استحکام کے ضابطے' ہوتا ہے۔(۲۷) جمہوری نظام نے دستور سازی کا اختیار عوامی نمائندگان پر مشتمل پارلیمنٹ کو دیا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کی خواہشات اور مفادات کی مطابقت میں ہو...... دستور، عوامی فلاح وبہبود، معاشی و سماجی انصاف اور امن و امان، بنیادی حقوق

اور شہری آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہو تا کہ عوام کے اقتدارِاعلیٰ کا عملی اظہار ہو سکے اور وہ مقصد پورا ہو، جس کے لئے عوام اپنی حکومت منتخب کرتے ہیں۔

جدید مغربی جمہوریت دیگر سیاسی روایات کی طرح، آئین و دستور کے لحاظ سے بھی اپنی تاریخ کو یونان و روما سے ماخوذ مانتی ہے۔ ارسطو نے چوتھی صدی قبل مسیح میں غالبًا پہلی دفعہ، عام قوانین اور ریاست کے آئین و دستور کا فرق واضح کیا۔ اسکے مطابق آئین، ریاست کے مختلف اداروں کی تنظیم اور انکے باہمی ربط کے قوائد اور دائرہ کردار کے اصول کا مجموعہ ہوتا ہے۔(۲۸)

قدیم ترین تاریخ انسانی سے ایسے قوائد و ضوابط کے شواہد ملتے ہیں جو انسانی رویوں کی اصلاح اور اجتماعی امور کی تنظیم کے لیے بنائے جاتے رہے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کے دور کے بابلی بادشاہ، حمورابی کی 'الواح دستور'(۲۹) کی شکل میں ہوں یا حضرت موسیٰؑ کے ' احکام عشرہ ' کی صورت۔ تاریخ انسانی کی کوئی قوم ان اصولوں کے بغیر نہیں رہی۔

قرآن جو خود پوری انسانیت کے لیے ابدی دستور کی حیثیت رکھتا ہے، یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قوم کو مذہب و شریعت کی صورت میں، ضابطہ حیات اور دستور و آئین ہمیشہ عطا ہوتا رہا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہے:

لکلّ جعلنا منکم شرعة وّ منهاجاً......،

لکلّ امّة جعلنا منسکاً هم ناسکوه......الآیه.(۳۰)

یہی وجہ ہے دنیا کی کئی قدیم ریاستوں میں مذہب کو دستور اور آئین کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ عربی زبان میں مذہب، **ذهب** سے مصدر ہے، جس کے معنیٰ چلنا اور گزرنا کے ہیں۔(۳۱) گویا، مذہب زندگی گزارنے کے طریقے، راستے اور اصول کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اردو زبان میں عقیدے، نظریے اور مسلک کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید میں مذہب کا لفظ مذکور نہیں، تاہم اس کے مترادفات آئے ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں سب سے اہم لفظ "دین" ہے جو قرآن نے ان معانی کے لحاظ سے زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ کئی مقامات پر یہ لفظ مذہب کے مترادف بھی آیا ہے مگر دراصل یہ دو بنیادی معنوں میں بار بار مذکور ہے۔ ایک تو بدلے اور جزا کے لیے، جیسے: **مالك يوم الدين**۔اور دوسرے ضابطہ حیات کے لیے، جیسے: **ان الدين عندالله الاسلام**. مؤخرالذکر آیت کریمہ میں قرآنِ حکیم نے یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ اسلام صرف مذہب نہیں دین ہے اور یہی وہ دین ہے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ، مقبول اور مثالی

ہو سکتا ہے اور کوئی نہیں!

جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے : **ومن يّبتغ غير الاسلام دينا فلن يّقبل منه......(۳۲)**

ریاست مدینہ کو جس میثاق کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے آئینی و قانونی بنیادیں فراہم کیں، تاریخ میں اس معاہدے کو 'کتاب' اور 'صحیفه' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، جس کے معنی 'دستور العمل' اور 'فرائض نامے' کے ہیں۔ باون دفعات پر مشتمل اس دستاویز کے ذریعے، رسول اللہ ﷺ نے چوبیس محلوں پر مشتمل، اندازاً دس ہزار آبادی کو ایک شہری ریاست کی صورت منظّم کر لیا۔ یوں ایک بوقلموں اور کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا۔ میثاق مدینہ کی دستاویز میں ایک جگہ لفظ 'دین' برتا گیا ہے جس میں مذہب اور حکومت کا مفہوم بیک وقت پایا جاتا ہے اور دونوں کو یکجا کرکے منظّم و مرتب صورت میں اس میثاق نے ایک ریاست کی شکل دے دی۔(۳۳)

لفظِ دین کے قرآنی مفہوم کو سمجھنے کے لئے ہم یہاں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تشریح نقل کرتے ہیں، جس سے نہ صرف اس لفظ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم واضح ہوگا بلکہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں دین کی حیثیت اور مقام بھی مترشح ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

قرآن مجید اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی مراد لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کرلے، اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالبًا دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے نظام پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ ''اسٹیٹ'' کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن ابھی اس کو ''دین'' کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لئے مزید وسعت درکار ہے۔(۳۴)

انگریزی زبان میں لفظ مذہب کا متبادل Religion استعمال ہوتا ہے جو دراصل فرانسیسی Religiex اور لاطینی Riligio سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی عقیدہ، طریقہ عبادت اور مافوق الفطرت قوتوں کے خوف و اطاعت سے منسلک ہیں۔(۳۵)

جہاں تک انسانی اجتماعیت، ریاست اور قانون و معاشرت کے حوالوں سے مذہب کے لازوال تاریخی کردار کا تعلق ہے، اس سے تو آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا مگر یہ حقیقت ہے کہ جدید جمہوری نظام میں مذہب کو وہ مرکزی حیثیت حاصل نہیں جو ہر انسانی معاشرے میں ہمیشہ سے رہی

ہے۔ اگرچہ قدیم مفکرین کی طرح سیاسیات کے جدید ماہرین بھی، مذہب کے سماجی کردار کی نفی نہیں کر سکے تاہم مذہب و سیاست کی دوئی اور مذہب کو انفرادی اور نجی معاملہ قرار دے کر، ریاستی نظام سے الگ کرنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔ چنانچہ ہے وڈ لکھتا ہے:

The impact of religion on political life has progressively been restricted by the spread of liberal culture& ideas.(36)

'آزاد خیالی اور آزاد ثقافت کے پھیلتے ہوئے اثرات نے، مذہب کے سیاست پر اثرات کو، بزور روک دیا ہے۔'

لہٰذا جدید جمہوریت میں، مذہب کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جدیدمغرب میں جمہوری ارتقاء کی کہانی، مذہب و سیاست کی کشمکش سے بھرپور ہے۔ آخر کار، مذہب کو انسانی معاشرے کے لیے ایک مشترکہ قیمتی اثاثہ سمجھنے کے بجائے، اسے ہر فرد کا، ذاتی اور نجی معاملہ قرار دیا گیا ہے۔(۳۷) مذہب کی نجکاری کے اس عمل (Privatization of Religion) نے اجتماعی سطح پر 'لامذہبیت' (Secularism) اور انفرادی سطح پر، 'آزاد مشربی' (Liberalism) کی تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ اینڈریو ہے وڈ (Heywood) کے بقول:

'لفظ آزادمنش، چودہویں صدی سے مستعمل ہے مگر اس کے کئی ایک مفاہیم ہیں۔ لاطینی میں یہ لفظ ایسے طبقے کے لئے بولاجاتا ہے جو (قدیم جاگیرداری نظام میں) نہ تو زرعی مزدور تھے اور نہ ہی غلام (بلکہ آزادی سے بہرہ ور تھے)۔'(۳۸)

'لبرل ازم' کی تحریک کا آغاز، زور شور کے ساتھ تو انیسویں صدی سے ہوا، مگر اسکی جڑیں چودہویں اور پندرہویں صدی کی نظریاتی اصلاحی تحریکوں (Reformation) میں مضمر تھی۔ آغاز میں یہ تصور، آزاد افراد معاشرہ کے لیے استعمال ہوا، اور بعد میں ایک طرز زندگی کی شکل میں مقبول ہو گیا۔

مغرب میں نئی روشنی کے عہد (Enlightenment) نے سائنس اور مذہب کے جس مخاصمے کا آغاز کیا اس کے نتیجے میں مذہب کو پسپائی اختیار کرنا پڑی اور سائنس نے فتح پائی۔ انسان نے مذہب کی فراہم کردہ سماجی اور اخلاقی روایات کو خیرباد کہا اور تہذیبی اقدار کی پابندیوں سے جان چھڑالی۔ یوں انفرادی آزادی کا سماجی انقلاب برپا ہوا جو کہ 'لبرلزم' پر منتج ہوا۔ چنانچہ راجر ایٹ ویل (Rojer Eatwell) لکھتا ہے:

Historically, the most important social influences on formation of

liberal individualism were the wars of religion and rise of modern science in the sixteenth and seventeenth centuries, and the passage from feudalism to capitalism from the same period through to the nineteenth century.(39)

بطور سیاسی نظریہ کے، لبرلزم کا وجود انیسویں صدی سے پہلے نہیں تھا۔ یورپ میں جاگیرداری کے خاتمہ اور سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے قیام کے بعد، متوسط طبقہ کی تمناؤں اور حسرتوں کا ابال ،لبرلزم کی صورت میں نکلا۔ سترہویں صدی کا انگریزی اور اٹھارہویں صدی کے امریکی و فرانسیسی انقلاب اس کا زور دار محرک بنے اور یوں انیسویں صدی لبرلزم کی صدی قرار پائی۔

جمہوریت اور لبرلزم دراصل جڑواں بہن بھائی ہیں۔ جنہوں نے جدید ریاست کے ہاں، نظام سرمایہ داری کی سرپرستی میں ولادت پائی۔ ان دونوں میں اشتراک کی بنیاد، شہری آزادیاں (Civil Rights) یا بنیادی حقوق ہیں۔ آغاز میں، یہ انفرادی آزادی کے حصول کے لیے سرگرداں تھے، اب یہ دیگر بنیادی حقوق کے طلبگار ہیں درحقیقت یہ صنعتی مغرب کا تحفہ ہیں اور بنیادی طور پر مذہب و سیاست کی علیحدگی کا مقصد سامنے رکھتے ہیں۔

لبرلزم کی ارتقائی شکل کا نام سیکولرزم (Secularism) ہے جو نہ صرف انفرادی آزادی کے نام پر تہذیبی روایت سے اجتناب کا داعی ہے بلکہ وہ جنس مذہب ہی کو زندگی کے اجتماعی نظام سے بے دخل کرنے کا متمنی ہے۔ اس مہم کے پیش کاروں نے بظا ہر دعویٰ یہ کیا ہے کہ یہ تحریک مذہب کے خلاف نہیں بلکہ یہ تو مذہب کو 'مناسب' مقام دلاتی ہے:

Liberal secularism is by no means an anti-religius tendency. Rather it is concerned to establish a 'proper' sphere and role for religion.(40)

یہاں مذہب کے لئے مناسب کردار اور موزوں دائرۂ کار کا انتخاب کرنے سے مراد، فلپ ہیمنڈ (Philip Hammond) کے بقول یہ ہے کہ علم وحی کو ناقابل اعتماد ٹھہرایا جائے اور یوں تمام ریاستی اداروں پر سے، مذہب کی فوقیت اور برتری ختم کر دی جائے:

Revelation is a distrusted source of knowledge...Religion has lost its presidency over institution ...(this constitutes a process of

secularization).(41)

اس کے برعکس اسلامی اصول سیاست میں، ریاست اور معاشرہ کی تنظیم و تعمیر میں مذہبی عقائد کا بنیادی کردار ہے۔ حکومت ایک مذہبی فریضہ کے طور پر انسانوں پر عائد ہوتی ہے تا کہ خالق کائنات کے عطا کردہ دستور و آئین کے مطابق، اجتماعی حقوق و فرائض کی تنظیم اور ادائیگی ممکن بنائی جائے ۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، بنیادی محکم اصول جو کہ ناقابل تبدیل و تنسیخ ہیں، قرآن مجید کی صورت میں، اللہ تعالیٰ کے عطاء کردہ ہیں۔ انسانی عقل محدود ہونے اور خواہشات کے تابع ہونے کی بنیاد پر، ایسادائمی وہمہ گیر قانون نہیں بنا سکتی جو آفاقی خصوصیات رکھتا ہوا ور ہر طبقے کے تمام انسانی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ضامن بن سکے، اس لیے بنیادی اصول، کتاب الٰہی اور سنت رسول ﷺ کے ذریعے واضح کر دیے گئے۔ جن کی عملی صورت رسول خدا ﷺ نے خود ایک ریاست قائم کرکے پیش کر دی ہے۔ لہذا، اب انسانوں کو اس قانون کی تنفیذ، جزیات و فروعات میں تبدیلی کا حق، وقت کے تقاضوں کی روشنی میں ،حاصل ہے۔ اس لیے سیاسی و سماجی امور میں، انسانوں کو چاہیے کہ وہ ،عدل وانصاف اور مشاورت و شوریٰ کے اصولوں پرعمل کرکے، اپنے لیے دستور و آئین تیار کریں۔ قرآن واضح کرتا ہے کہ:

۱۔ اقتدار اعلیٰ کا اصل مالک خالق کائنات ہے، کوئی انسانی ادارہ ، کوئی طاقتور حاکم یا انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی اس کا مالک نہیں ٹھہر سکتا:

انّ ربّکم اللّٰه الّذی خلق السمٰوٰت و الارض...... ألا له الخلق والامر. تبٰرك اللّٰه ربّ العالمین.

إن الحكم إلاَّ للّٰه. أمر الّا تعبدوا إلاَّ إيّاه. ذالك الدّين القيّم ولٰكنّ أكثر النّاس لا يعلمون.

'فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو، یہی سیدھا طریق زندگی ہے۔ جبکہ اکثر لوگ اس حقیقت کا ادراک نہیں کر رہے۔'

۲۔ دستور و آئین کا بنیادی مآخذ کتاب الٰہی ہے جس میں بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں انسان کو چاہئے کہ ان اصولوں کو اپنے حالات کے مطابق بنیاد بناکر اپنے لئے نظام وضع کرے۔ جو افراد اس آئینی و دستوری بنیاد کے خلاف فیصلے کریں گے وہ کافر و باغی تصور ہوں گے۔ جب کہ اس آئین و قانون کی مثالی تشریح وتعبیر اور عملی تطبیق و تنفیذ رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال اور اعمال ہیں:

إن الحكم إلّا للّٰه. يقصّ الحق وهو خير الفٰصلين.

'فیصلہ کا سارا اختیاراللہ تعالیٰ کو ہے، وہی امرحق بیان کرتاہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔'

أفغيراللّٰه أبتغي حكماً وّ هوالّذی انزل اليكم الكتٰب مفصّلا. والّذين اٰتينٰهم الكتٰب يعلمون انّه منزّل مّن رّبّك بالحقّ فلا تكوننّ من الممترين. وتمّت كلمَت ربّك صدقاً وّ عدلاً لا مبدّل لكلمٰته و هو السميع العليم.(۴۲)

'تو کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کردی ہے، اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے، لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔'

۳۔ اسلامی ریاست کاوجود، خلافت الٰہیہ کے قیام کے لیے ہوتا ہے۔ جس طرح کہ رسول آخر الزماں ﷺ نے مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کرکے اس کا آغاز کیا تھا۔ اب مسلمانوں کی تاقیامت آنے والی حکومت، دراصل رسول اللہ ﷺ کی نیابت و جانشینی ہوگی جسے خلافت کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن نے اسی سلسلہ میں واضح طور پر اہلِ اسلام کو ہدایت کی ہے کہ وہ:

ا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور اس اطاعت کی روشنی میں اپنے اجتماعی معاملات کے ذمہ داران 'اولی الامر' کی اطاعت کریں:

يٰايها الذين اٰمنوا أطيعوا الله و أطيعوا الرسول وأولی الأمرمنكم اور یہ کہ:

۲۔ اگر وہ ان شرائط کے مطابق ایمان اور اعمال صالحہ کے لحاظ سے دنیا پر فوقیت رکھتے ہونگے تو اللہ انہیں زمین کی حاکمیت عطا کرے گا:

وعداللّٰه الذين اٰمنوا منكم وعملوا الصٰلحٰت ليستخلفنهم فی الأرض. اور اس طرح:

۳۔ جب بھی مسلمانوں کو زمینی اقتدار یا تمکن فی الارض عطا ہو گا تو وہ دین اسلام کی سربلندی اور اس کی تنفیذ میں سرگرم عمل ہو جائیں گے:

الّذين ان مّكنّهم فی الأرض أقاموا الصّلوٰة واٰتوا الزكوة وأمروا بالمعروف و نهوا عن

المنکر..(۴۳)

اسلامی اصول سیاست میں، ریاست کا قیام، ایک فریضہ قرار دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا دیا ہو انظام حیات، بطور آئین و مذہب کے، قائم و دائم ہو، حقوق و فرائض کا تعین اور تحفظ ہو اور انسانی معاشرے عدل پر قائم ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ اسلامی ریاست و حکومت کے لیے دعا مانگی، اسکو عملاً قائم کر کے دکھایا اور اسے اللہ کی رحمت قراد دیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان سیاسی مفکرین، اسلامی ریاست و حاکیت کا قیام پوری انسانیت کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں جسکے بغیر دین و دنیا کی بھلائی ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، امام ابن تیمیہؒ کی رائے ملاحظہ ہو، آپ فرماتے ہیں:

ان ولا یة امرالناس من اعظم واجبات الدین بل لاقیام للذین الابها. (۴۴)

اسلامی ریاست، ایک ذمہ دار افراد کا منظم مذہبی معاشرہ ہے جو اپنا حقیقی مقتدر اعلیٰ خالق کائنات کو مانتے ہوئے اس کے عطاء کردہ اختیارات حکومت، اپنے میں سے اہل تر افراد کو سونپتے ہیں اور باہمی مشاورت سے اپنے معاملات میں بہتری کی مثبت کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہو کر، ایک خوشگوار ماحول اور خوشحال معاشرہ تشکیل دیتے ہیں، جس میں انصاف کا بول بالا ہوتا ہے اور لوگ اپنے رب کی اطاعت کے لئے سازگار ماحول پاتے ہیں۔ ٹھیک یہی ہے وہ اصل مقصد جسکے لیے اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کو مبعوث کرتا ہے، جیساکہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: **لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت وانزلنا معهم الکتٰب والمیزان لیقوم النّاس بالقسط..** 'تاکیدہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور انکے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں'...... اس آیت میں مذکور 'کتاب اور میزان' وہ اصول و دستور ہیں جو اسلامی ریاست میں بنیادی ضابطہ حیات کے طور پرکام کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح طور پر بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کرنے والا معاشرہ، اپنے لیے ظلم، فسق اور کفر کا راستہ منتخب کرتا ہے:

ومن لم یحکم بما انزل الله فاولٰئك هم الکٰفرون.

ومن لم یحکم بما انزل الله فاولٰئك هم الظّٰلمون.

ومن لم یحکم بما انزل الله فاولٰئك هم الفٰسقون. (۴۵)

ملک اور قوم (Country & Nation)

جدید سیاسی مفکرین کے مطابق، ریاست کی بنیاد چار عناصر پر رکھی گئی ہے: ا۔ آبادی

۲۔ علاقہ ۳۔ اقتدارِاعلیٰ ۴۔ حکومت...... آج کل ان چاروں اصولوں پر مشتمل انسانی آبادی کو سیاسی زبان میں ایک ملک یعنی Country بھی کہا جاتا ہے اور ایک قوم یعنی Nation بھی۔ گویا 'کنٹری' یعنی ملک کا لفظ 'سٹیٹ' یعنی ریاست کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ریاست سے متعلق بحث، اس مضمون کے پہلے حصے میں کی جا چکی ہے، ہم یہاں لفظ قوم کا تجزیہ قدرے تفصیل سے کریں گے۔

کسی خاص خطہ زمین میں رہنے والے کسی گروہ انسانی یعنی قوم کے لیے انگریزی زبان میں نیشن (Nation) کا لفظ تیرہویں صدی سے مستعمل ہے۔ یہ لاطینی (Latin) لفظ Nasci سے اخذ کیا گیا ہے، جس کے معنی پیدا ہونے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ Nation سے مراد لغوی معنوں کے لحاظ سے، ایسا گروہ انسانی ہے جو ایک خاص علاقے سے پیدائشی طور پر منسلک ہو۔ اسی بنیاد پر سیاسی مفکرین کے ہاں قوم سے مراد انسانوں کی ایسی اجتماعیت ہے جو اشتراک نسل کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو، یعنی:

A breed of people or a racial group.(46)

اس تعریف کی رو سے دیکھا جائے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ قوم کے لفظ کو ملک Country یا ریاست State کے ہم معنی کے طور پر استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ جبکہ آج کل، کسی ملک کی شہریت یا رکنیت کے اظہار کے لیے بھی کسی فرد کے نام کے ساتھ قومیت Nationality کے لفظ کا استعمال کیا جانے لگا ہے، جو درحقیقت مغالطہ آمیز ہے کیوں کہ کسی ایک ملک میں پیدا ہونے والا شخص کسی دوسری ریاست کا شہری ہو سکتا ہے۔ شہریت یعنی Citizenship اور قومیت یعنی Nationality الگ مفہوم رکھتے ہیں، اور کسی ایک فرد کے یہ دونوں حوالے مختلف ہوسکتے ہیں یعنی مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے ایک ملک کے شہری ہو سکتے ہیں اور ایک قومیت رکھنے والے مختلف ملکوں کے شہری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان دو الفاظ کو ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔

ملک اور قوم کو ایک مفہوم میں استعمال کرنے کا یہی بنیادی مغالطہ 'اقوام متحدہ' (United Nations) کے نام میں موجود ہے۔ اقوام متحدہ بنیادی طور پر ریاستوں یا ملکوں کے اتحاد کا نام ہے، قوموں کا نہیں۔(۴۷) اس خلط مبحث کی وجہ لفظ قوم کی اوّل الذکر وہ تعریف ہے جو کچھ سیاسی مفکرین نے کی ہے۔ قوم اپنے وسیع تر مفہوم میں ایسے گروہ انسانی کے لیے استعمال ہونا چاہیے جو نسل، مذہب، رہائش، زبان اور تہذیب کا اشتراک رکھتا ہو۔ اسی بنیاد پر ہے وڈ (Heywood) نے اسے سیاسی کی

بجائے ثقافتی اجتماعیت کا نام دیا ہے، وہ لکھتا ہے:

A ' Nation' is a cultural entity, a body of people bound together by a shared cultural heritage. It is not therefore, a political association, nor is it necessarily linked to a particular territorial area.(48)

'ایک قوم دراصل ایک ثقافتی شناخت کا نام ہے۔ لوگوں کا ایسا جتھہ جو مشترک ثقافتی ورثے میں بندھا ہوا ہو۔ لھذا یہ سیاسی اجتماعیت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کسی خاص علاقہ زمین سے منسلک ہونا لازم ہوتا ہے۔' اس اشتراک کے ساتھ ساتھ افراد قوم میں، ایک ہونے کا احساس، کسی قوم کی ساخت کا لازمی عنصر ہے جسے جذبہ قومیت یا Spirit of Nationality کہتے ہیں۔ اس احساس یگانگت کے بغیر کوئی قوم معرض وجود میں نہیں آتی، بھلے اس میں درج بالا اشتراک پوری طرح موجود ہو۔

تصور قومیت کے، اس فلسفیانہ پس منظر کے ساتھ مغربی معاشروں میں دور جدید کی قومیت پرستی (Nationalism) کا جائزہ لینا ضروری ہے ، جو اس وقت جدید جمہوریت کا فکری و عملی حلیف بنا ہواہے۔ قومیت دراصل اپنی اجتماعیت کے ساتھ لگاؤ، اپنے ملک سے وفاداری، اپنی تاریخ کے ساتھ منسلک رہنے کا شعور اور اپنے مشترکہ ورثے کے ساتھ وابستگی کے احساس کا نام ہے۔ یہ احساس اپنی شناخت، تعارف اور یکجہتی قائم رکھنے کے لیے بنیادی کام کرتا ہے لیکن قومیت کا جذبہ ان حدود سے آگے بڑھ کر اپنے تحفظ کی بجائے اپنے تفوق اور برتری کے جنون میں تبدیل ہو جائے اور اپنے مفادات اور مقاصد کی تکمیل کی بجائے ہوس اور تکبر کا روپ دھار لے تو انسانی اجتماعیت آگ کا آلاؤ بن جاتی ہے، جہاں نفرت اور انارکی کا راج ہوتا ہے۔ جیسا کہ جنگ عظیم میں بین الاقوامی سطح پر یہ مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔

بقول ڈکنسن (Dickinson) جنگ عظیم کا پس منظر اور پیش منظر ایک بین الاقوامی انتشار International Anarchy کا نام ہے۔(۴۹)

قوم پرستی کی تحریک بظاہر انقلاب فرانس کی پیداوار تھی مگر حقیقتاً اس کے بیج، یورپ میں صدیوں سے جاری، ایک فکری کشمکش نے بوئے تھے جن کی آبیاری، تحریک اصلاح (Reformation Movement)، نشأۃ ثانیہ (Renaissance) اور جمہوریت کے ارتقاء (Evolution of

Democracy) نے کی تھی۔

یورپ کے قرون وسطیٰ (Midle Ages) اور دور ظلمت (Dark Ages) کے دوران میں، پوپ اور بادشاہ کے درمیان جاری اقتدار کی کھینچاتانی، اس عوامی نقطہ نظر پر منتج ہوئی کہ اقتدار، ان دونوں کا نہیں بلکہ قوم کا ہے۔ لہٰذا جن کا حق ہے انہیں اس کے لئے متحرک اور منظم ہونا چاہیے۔ وقت گذرنے کیساتھ ساتھ یہ نقطہ نظر ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اس تحریک کی بنیاد کے لیے ایک روحانی جذبہ کی ضرورت تھی، جو باہم اتحاد و یگانگت کی بنیاد بن سکے۔ یہ جذبہ، قومیت کے جنون کی صورت میں میسر آ گیا۔

جلتی پہ تیل کا کام یونانی علوم کی ترویجِ جدید یعنی نشأۃ ثانیہ (Renaissance) نے کیا، اس لیے کہ یہ تحریک، یونانی افکار اور تہذیب کے احیاء کی تحریک تھی اور اپنے اندر قدیم یونانی قومیت پرستی کے جراثیم لیے ہوئے تھی۔ ان جراثیم کی نشوونما کا کام نشأۃ ثانیہ Renaissance کا مخصوص تصور انسانیت یعنی Humanism کر رہا تھا۔ ہیومینزم دراصل، انسانی زندگی اور مسائل زندگی کو انسانی سطح پر جانچنے اور سنوارنے کا نام تھا۔ اس داعیے کا بنیادی نعرہ یہ تھا کہ انسان اپنی حیثیت میں انفرادی سطح پر اہم ہے۔ کسی الہامی، مذہبی اور اخلاقی میزان کی ضرورت نہیں، انسان خود ہی معیار خیرو شر ہے۔ وہ اپنے لیے مفید اور مضر کا فیصلہ خود کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسے اپنا مقدر خود بنانے کا موقع ملنا چاہیے۔

'انسان خود اہم ہے...... میں اہم ہوں...... اور پھر یہ کہ...... ہم اہم ہیں'۔ یہ ''میں'' سے ''ہم'' تک کا سفر، قومیت پرستی کی ساری داستان ہے۔ اسی کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ کسی ملک میں عوام خود، اقتداراعلیٰ کے مالک ہوتے ہیں لہٰذا قوم خود اپنی تقدیر کی مالک ہے:

The nation should be its own master.(50)

اس فکری بنیاد پر Self-government کی دیواریں استوار ہوئیں۔ مطلق العنان حکومتوں کے خلاف عوامی ردعمل، یورپی اقوام میں تیزی سے بڑھتا گیا۔ سلطانی جمہور کا دور قریب آتا گیا۔ جذبہ قومیت ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ امریکی اعلان آزادی (۱۷۷۶ء)، انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) اور نپولینی جنگیں (۱۷۹۲ تا ۱۸۱۵ء) اس تحریک کی کامیابی کے سنگ میل ثابت ہوئیں۔ یوں انیسویں صدی، قومیت کے ارتقاء کی صدی ٹھہری، جسکے اختتام پر قومی پرچم، قومی ترانے، حب الوطنی کے نغمات، عوامی تقریبات میں گونجنے لگے، قومی تعطیلات کا نظام اور قومی زبان بطور ذریعہ تعلیم جیسے مظاہر دنیا بھر میں، ایک جنون کی صورت زور پکڑ گئے۔

ہر قوم نے اپنی اعلیٰ صفات کے نعرے لگا کر اپنی سرحدوں سے باہر پھلانگنا شروع کر دیا۔ اور یورپ کی طاقتور قوموں نے نوآبادیاتی استعمار (Colonial Expansion) کی مہم جوئی شروع کر دی۔ آدھی دنیا یورپی تسلط میں آ گئی۔ قومیت پرستی کے جنون نے بیسویں صدی کے وسط تک کروڑوں انسانوں کو، دو عظیم جنگوں کی بھینٹ چڑھا دیا:

> The nineteenth century was a period of nation building..... Such nationalism became increasinly chauvinistic and xenophobic...... Nationalism was therefore a powerful factor leading to war in both 1914 and 1939.(51)

یہ سفر ابھی رکا نہیں۔ یہ طوفان ابھی تھما نہیں۔ دنیا میں قومیں اسی فلسفے کے تحت اپنے قومی معاملات چلاتی ہیں۔ تمام خارجہ پالیسیاں اور تمام بین الاقوامی فیصلے اور معاہدے، 'انسانی مفاد' کی بجائے 'قومی مفاد' کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

جدید سیاسی فکر کے اس تصور قومیت کو سامنے رکھتے ہوئے، اب ہم اسلامی اصول سیاست کی روشنی میں اس کا تجزیہ کریں گے کہ قرآنی تعلیمات میں قومیت کے تصور کا کیا مقام ہے اور اسلامی سیاسی فکر قومیت کے کس نظریہ کو انسانیت کی بھلائی اور خیر کے لیے موزوں سمجھتا ہے۔

عربی میں قوم کا لفظ اگرچہ صرف مردو ں کے گروہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے مگر قرآن میں اس سے مراد مردوں اور عورتوں کی مشترکہ جماعت یا اجتماعیت ہی لیا گیا ہے۔ یوں تو انسانی گروہ کے لیے قرآن نے شعب، فرقه یا فریق اور شیعه کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، لیکن اس مفہوم میں قرآن کے اندر کثرت سے استعمال ہونے والا لفظ قوم ہی ہے۔(۵۲) جہاں تک اس لفظ کے تاریخی پہلو کا تعلق ہے، کتاب الٰہی میں اس کا ذکر درج ذیل حوالوں سے آیا ہے:

۱۔ کسی خاص طرز فکر و عمل رکھنے والے گروہ کے لیے جیسے:

ان فی ذٰلکم لاٰیٰتٍ لّقومٍ یؤمنون.

۲۔ کسی نبی کی امت اور کسی بادشاہ کی رعایا کے لیے، جیسے:

من بعد قوم نوح... من قوم فرعون...... اتذر موسیٰ وقومهٗ...الخ

۳۔ کسی خاص علاقے میں رہنے والے انسانی گروہ کے لیے جیسے:

قالوا لا تخف انا ارسلنا الیٰ قوم لوط...الآیة

۴۔ کسی خاص نسلی اور نظریاتی پس منظر، توارث اور تشخص کے حامل گروہ کے لیے قوم کے ساتھ ملت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے:

انی ترکت ملة قوم لا یؤمنون...... ملت ابیکم ابرٰھیم....الآیہ

۵۔ کسی عقیدے اور مسلک کے حامل گروہ انسانی قوم کے ساتھ امة بھی آیا ہے:

ومن قوم موسیٰ امة یھدون بالحق وبه یعدلون.

تاہم امت کا لفظ اصلاً ایک مقدس فریضہ حیات کے ضمن میں استعمال کیا گیا ہے، جیسے:

کنتم خیر امة اخرجت للنّاس...... الآیہ

ولتکن منکم امّة یدعون الی الخیر......(۵۳)

معلوم یہ ہوا کہ قرآن نے قوم کا لفظ یا تو ایسے انسانی گروہ کے لیے استعمال کیا:

۱۔ جو ایک خاص نقطۂ نظر کا حامل ہواور خاص کلچر یا تہذیب رکھتا ہو،

۲۔ یا ایسی اجتماعیت کے لیے جو ایک دستوراور اقتدار و حکومت کے تحت ہو،

۳۔ یا ایسی جماعت انسانی کے لیے جو خاص علاقے میں رہائش پذیر ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ کسی ایسی قوم کے لیے جو خاص نسلی توارث اور نظریاتی تشخص کی حامل ہو، قرآن نے ملة کا لفظ استعمال کیا ہے اور ایسی ملت کو جو اپنے سامنے ایک فریضہ اور نظریاتی مقصدیت رکھتی ہو امة کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

لفظ قوم کے اس مفہوم کی روشنی میں، اب ہم اس نظریہ کا مطالعہ کریں گے جو قرآن مجید نے، پوری قوم انسانی کے بارے میں واضح کیا ہے، کہ:

۱۔ پوری انسانیت ایک برداری اور مساوی انسانی رشتے میں مربوط ہے:

یٰآیّھا الناس اتقّوا ربکم الذی خلقکم من نفس وّاحدة وّخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیراً ونسآء...

۲۔ نسل ،قبیلہ اور علاقے کی تخصیص صرف پہچان کے لیے ہے؛ برتری اور تعصب کی بنیاد نہیں۔ تم میں سے معزز وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے:

یٰآیّھا الناس انا خلقنکم من ذکر وّانثیٰ وجعلنکم شعوباً و قبآئل لتعارفوا انّ اکرمکم عنداللّٰہ اتقٰکم...

۳۔ قوموں اور گروہوں میں انسانیت کی تقسیم تکبر اور تعصب کی علامت اور قابل مذمت ہے۔ اس سے تمہارے درمیان دشمنی بڑھ جاتی ہے:

انّ فرعون علا فی الارض و جعل اھلھا شیعا یّستضعف طائفة منھم یذبح ابنائھم و یستحیٖ نسآئھم. انّہٗ کان من المفسدین.

۴۔ تقسیم اور تفرقے کا یہ رویہ انسانی اجتماعیت کے لیے مفید نہیں ہے لہٰذا اس طرزِ عمل سے بچنا اور ایسے لوگوں کا ساتھ نہ دینا جو اس مرض میں مبتلا ہو جائیں:

ولا تکونوا کالذین تفرّقوا واختلفوا من بعدماجاء ھم البیّنٰت....

ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله...(۵۴)

پارلیمنٹ ،ووٹ اور کثرت رائے کا اصول

Parliament, Vote & Majority Principle

دورِ قدیم سے، سربراہ حکومت کے ساتھ ساتھ نظام مملکت کو چلانے کے ذمہ دار افراد کا ایک ادارہ موجود رہا ہے۔ قرآنِ کریم نے قدیم بادشاہوں کے ذکر میں ایسے ادارے یا مجلس کو 'ملاء قوم' کے نام سے یاد کیا ہے۔ ایران کی قدیم سلطنت میں اس کا نام مجلس بزرگان (Elders Council) اور یونان میں مجلس پنج صد کے نام سے اس کے وجود کا ثبوت ملتا ہے اور آج کے دور میں یہی ادارہ پارلیمنٹ (Parliament) (لاطینی کے لفظ *parliamentum* سے ماخوذ) کہلاتا ہے۔

سرزمینِ عرب میں مکہ اور یونان کی قدیم شہری ریاستوں میں یہ ادارہ بالترتیب 'دارالندوہ' اور 'ھیلیا' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یونانیوں اور عربوں نے اپنی پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے افراد کی اہلیت، عمر اور ان کے اختیارات کا پورا نظام، وضع کر رکھا تھا۔(۵۵) نظام جمہوریت نے اپنا کوئی نیا ادارہ متعارف نہیں کروایا بلکہ اسی قدیم روایتی ایوان ہی کو اپنا لیا ہے۔ جمہوری فکر میں اقتدار کا اصل مالک عوام کو مانا گیا ہے۔ جدیددور میں آبادیوں کی کثرت نے عوام کی، اقتدار میں براہ راست شرکت کو ناممکن بنا دیا ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ ایک ایوان نمائندگا ن ہو جس میں لوگوں کے منتخب نمائندے عوامی مفادات کے مطابق ان کے دیئے گئے حق اقتدار کو استعمال کر سکیں۔ یہ ایک مشاورتی ادارہ ہو جس میں قانون سازی ممکن ہو سکے۔(۵۶)

پارلیمنٹ دراصل عوامی ایوان نمائندگان ہوتا ہے، جس کا ارتقاء بارہویں صدی سے شروع ہوا۔ آج کل اس ادارے کے ممبران، بذریعہ انتخابات Elections عوامی اکثریتی رائے Vote کی بنیاد پر

منتخب ہوتے ہیں۔ انتخابات کے ذریعے قائم ہونے والی نمائندہ حکومتوں کا جمہوری نظام، یورپ میں سترہویں صدی عیسوی سے رو بہ عمل ہے، لیکن اس عمل میں عوام کی (بذریعہ ووٹ) شرکت کی داستان پرانی نہیں ہے۔ بالغ رائے دہی کا اصول Adult Suffrage جو 'ایک شخص، ایک ووٹ' one person, one vote کی بنیاد پر عمل میں آتا ہے، تقریباً نصف صدی قبل معرض وجود میں آیا ہے، جبکہ عورتوں کو ووٹ کا حق ملے ابھی اتنا عرصہ بھی نہیں گذرا۔ تاہم صدیوں کے سفر نے اب یہ ممکن بنا دیا ہے کہ معاشرے کے افراد کی اکثریت، انتخابی عمل میں شریک ہو کر اپنے ایوان نمائندگان کا انتخاب کر سکتی ہے۔

یورپ میں یہ ادارے تیرھویں صدی میں قائم ہونا شروع ہوئے۔ سترہویں صدی میں اس ادارے نے بادشاہ کے مقابلے میں عوام کے حقوق کی نمائندگی کرتے ہوئے آمریت کیخلاف مزاحمتی کردار ادا کرنا شروع کیا۔ اس سے اس ادارے کا اصل جمہوری روپ سامنے آیا۔ انیسویں صدی میں سیاسی پارٹیوں کا ادارہ، یورپ و امریکہ میں معرض وجود میں آیا اور بیسویں صدی میں اسے پوری دنیا میں پذیرائی ملی۔

سیاسی پارٹی دراصل ایسا انسانی گروہ ہے جو سیاسی طاقت کے حصول کا خواہشمند (A group of people seeking political power) ہوتا ہے جو عوام الناس کی سیاسی تربیت کر کے ان کی رائے کو اپنے حق میں استعمال کرتا ہے تاکہ اسکے نامزد کردہ افراد کو لوگ منتخب کریں اور وہ اسطرح پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرے اور یوں اقتدار کے ایوانوں میں براجمان ہو، اور اپنے فلسفے کے مطابق اجتماعی نظام ترتیب دے سکے۔

مغرب میں پارلیمنٹ (Parliament) اور اسمبلیوں (Assemblies) کو عوام کی حاکمیت کی عملی صورت گردانا گیا ہے۔ لہٰذا اسے ہر طرح کے دستور و قانون کی تخلیق، تجویز اور ترمیم کا حق حاصل ہے۔(۵۷)

پارلیمنٹ کے حوالے سے ایک اہم پہلو جو جدید جمہوریت کی بنیادوں میں سے ہے اور اسلامی اصول سیاست سے مطابقت رکھتا ہے وہ نظام شورائیت ہے۔ پارلیمنٹ یا نمائندہ اسمبلی بحث وتمحیص کے نتیجے میں عوام الناس یا رعایا کے لیے بہتر سے بہتر فیصلہ، ان کے نمائندوں کی آراء کی بنیاد پر کرتی ہے، یہ پہلو اسلامی اصول سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ قرآن نے اہل اسلام کے امور کو مشاورت کے ساتھ طے پانے کو پسندیدہ قرار دیا ہے اور رسول خدا ﷺ کو **وشاورھم فی الامر**

(معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے) کی تاکید کی ہے، اسی بنیاد پر یہ اسلامی حکومت کے دستور کی لازمی شق ہے اور اسلامی تاریخ کا طرۂ امتیاز بھی!

خلافت اسلامی کے عہد میں ایوان مشاروت، ایک نمائندہ اہل الرائے کا ادارہ تھا جہاں مسلمانوں کی اہم شخصیات جمع ہوکر خلیفہ کو مشورہ دیتیں۔ حضرت عمرفاروقؓ (خلیفہ دوم) نے اس مشاورتی ادارے کو وسیع کیا اور اس کے اجلاسوں کی تعدا د بڑھائی۔ تاہم مشاورت کے اصول، مقاصد اور طریقۂ کار ایسی چیزوں میں جمہوری سیاست اور اسلامی تعلیمات میں بہت فرق ہے۔ اسلامی اصول کے مطابق کسی ہیئت حاکمہ کو، وہ ایک فرد پر مشتمل ہو یا کئی افراد پر، قرآن و سنت کے فراہم کردہ دستور و قانون میں ترمیم کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہاں نئے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی کا پورا اختیار انہیں حاصل ہے اور تمام نزاعی امور میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے رجوع کا حکم ہے: **فان تنازعتم فی شیءٍ فردّوہ الی اللّٰہ والرسول......** (۵۸)

پارلیمنٹ کے ممبران یا عوامی نمائندگان کے سلسلہ میں بھی جمہوری اصول اور اسلامی طریق مختلف ہیں۔ جمہوری نمائندہ ایوان ، عوام کی اکثریت (انتخابی طریق کار کے مطابق) کی حمایت کے حامل افراد پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں کسی کے کردار اور اہلیت کو بنیاد نہیں بنایا جاتا۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کے ساتھ زیادہ لوگ ہیں بلکہ کس نے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ کرلیا ہے۔

جبکہ اسلامی شوریٰ کے ممبر ہونے کی کچھ خاص شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ جن میں قابلیت و اہلیت، دیانت و امانت اور اخلاق، کردار کی اعلیٰ صفات کو لازم قرار دیا گیا ہے۔(۵۹) عوامی اکثریت کی حمایت کوئی بنیادی شرط اہلیت کے طور پر نہیں رکھی گئی تاہم یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ایسے افراد نمایاں اور نمائندہ کردار و حیثیت کے مالک ہوں اور درجِ بالاصفات کے حامل بھی۔ ایسے عوامی نمائندے جن کے ذمے محلے یا اپنے علاقے کے معاملات کی ذمہ داری ہوتی اور خلیفہ انہیں اپنی مشاورت میں شریک کرتے حدیث کی زبان میں 'العرفا' کہلاتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان العرافة حق ولا بد للناس من العرفاء ..

عرفاء دراصل عریف کی جمع ہے جو مدبر، منتظم اور سردار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(۶۰)

قرآن مجید نے عوامی نمائندگان کے لیے 'نقیب' کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے حوالے سے کہا گیا: **وبعثنا منهم اثنَی عشرنقیباً**.(۶۱) اور رسول کریم ﷺ نے بھی ہجرت مدینہ

سے پہلے بیعت عقبہ کے موقع پر نقیب مقرر کیے تھے...... تاہم کسی ریاست کی بااختیار ہیئت حاکمہ کے لیے قرآن نے دو تراکیب استعمال کی ہیں: ایک تو ملاء القوم جو کہ فرعون مصر اور ملکہ سبا کے ذکر میں آیا ہے:

قال الملأ من قوم فرعون انّ هذا لَسٰحرعليم ۔ اور قالت يٰآيّها الملئُوا افتونی فی امری...

دوسرا اولی الامر جو کہ خاص طور پر مسلمان حکام کے لیے استعمال ہوا ہے :

اطیعوا اللّٰه واطیعوا الرسول واولی الامر منکم..(۶۲)

اولی الامر سے مراد قوم کے وہ ذی عقل اور ذی رائے لوگ ہوتے ہیں جو صلاحیت اور اہلیت کی بنیاد پر عوام الناس کے اجتماعی امور کے ذمہ دار بنائے گئے ہوں۔ اسی بنیاد پر امام فخرالدین رازی اور الماوردی نے ایسے افراد کو اهل الحل والعقد کہا ہے۔(۶۳)

جدید جمہوریت عوام کی حاکمیت کو عمل میں لانے کے لیے قوم کے نمائندوں کے چناؤ میں اور ایوان نمائندگان کے اندر مختلف فیصلوں میں کثرت رائے کا اصول اپناتی ہے۔جمہوری معاشرے میں فرد ایک ووٹ رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں تمام افراد یکساں اور مساوی ہیں۔ جس رائے کے حق میں ووٹوں کی اکثریت ہو جائے وہ فیصلہ بن کرنافذ ہو جائے گا اور جو فیصلہ زیادہ لوگوں کی حمایت نہیں رکھتا، وہ نہیں اپنایا جائے گا۔ جمہوری ریاست کا بنیادی مقصد عوام کی حاکمیت کا قیام ہے اور وہ اسی طریقے میں عمل میں آ سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں قرآنِ مجید کی تعلیمات حکمت کا خلاصہ یوں ہے:

۱۔ شعور و بصیرت کے لحاظ سے تمام انسان مختلف اہلیت و صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں، باشعور اور جاہل آپس میں برابر نہیں ہوتے:

هل يستوی الّذين يعلمون والّذين لايعلمون...... اور قل هَلْ يستوی الاعمیٰ و البصير.

۲۔ پاکباز فطرت والے اور بد طینت برابر نہیں ہو سکتے،بے شک برے متأثر کن کثرت میں ہوں:

قل لا يستوی الخبيث و الطيب ولواعجبك كثرة الخبيث..

۳۔ انسانوں کی اکثریت عموماً اپنے فیصلے خواہشات اور جذبات کے تحت کرتی ہے۔ اس طرح کے فیصلے جہالت، شرک، فسق اور ظلم کا باعث بنتے ہیں۔ لہٰذا اس اصول کو اپنانا درست نہیں اور نہ ہی مفید ہے۔ اکثریت کا عموعی رویہ اللہ کے راستے سے ہٹا ہوا اور ایمان اور تشکر کے اصولوں سے عاری ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی پیروی گمراہی کے راستوں پر لے جاتی ہے:

وان تطع اکثر من فی الارض یضلّوك عن سبیل اللّٰہ ان یتبعون الا الظن وّ ان هم الا یخرصون.(۶۴)

ان اصولوں میں جہاں عوامی اکثریت کی رائے پر اہم فیصلے کرنے سے احتراز کی ہدایت کی گئی ہے وہاں صایب الرائے، صاحب بصیرت اور اچھے کردار کے مالک، افراد معاشرہ سے رائے لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول ﷺ خدا کے اپنی قائم کردہ ریاست میں اور آپ کے تیار کردہ خلفاء نے اسلامی ریاست و حکومت کے نظام کو انہیں اصول و ضوابط کی روشنی میں چلایا ،تاریخ اس کی شاہد ہے۔ تاہم یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

۱۔ آیا درج بالا حوالوں کی روشنی میں، عام انسانوں کی مجرد اکثریت ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہے یا اس کا اطلاق اہل ایمان کے سواداعظم اور جمہور مسلمانوں پر بھی ہو گا؟

۲۔ دوسرا یہ کہ آیا کثرت رائے کا حصول صرف انتخاب کے عمل میں ممنوع قرار پاتا ہے یا کسی بھی نمائندہ ایوان میں فیصلوں کے حوالے سے بھی؟

جہاں تک سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے تو بنظر عمیق جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عوام الناس کے عمومی رویے کا مزاج بتایا گیا ہے اور زندگی کے اہم فیصلوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مقابلے میں عوامی رائے کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے۔

جہاں تک ایمان لانے والوں اور اپنے آپ کو اعمال صالحہ سے مزین کر لینے والے لوگوں کا تعلق ہے تو ایسے انسان اللہ کی نظر میں عوام الناس سے ممیّز اور ممتاز ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو قرآن مجید نے قابل قدر ناموں سے پکارا ہے۔ صادقین، متقین، خسارے سے پاک، خوف و حزن سے محفوظ اور اہل بصیرت قرار دیا ہے۔(۶۵) جہاں تک کسی ایوان میں ریاستی اور اجتماعی فیصلوں کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں برابر وزن کے دلائل و آراء کی صورت میں، مختلف فیہ مسائل میں کثرت رائے کا اصول اپنانے کے علاوہ چارۂ کار نہیں ہے۔ تاریخ اور فقہ اسلامی کی کتب میں موجود قال الجمهور کے الفاظ سے اس پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ اہل بصیرت اور اہل الرائے کی نمایاں اکثریت کو ہی جمھور کہا گیا ہے، جو کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم بھی ہے۔(۶۶)

تاہم تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خود شارع اس اصول سے ماوراء ہیں۔ قانون سازی میں مسلمانوں کی اکثریت کی تائید یا مفاد کا خیال رکھنا تو ضروری سمجھا گیا ہے مگر کسی فیصلے کی بنیاد محض اس بات کو نہیں بنایا گیا کہ اسے عوامی اکثریت کی حمایت حاصل ہے لہٰذا

اسی کو قانون بنا لیا جائے بلکہ اس بات کا اختیار خلیفہ وقت (سربراہ مملکت) کو دیا گیا ہے کہ وہ مناسب فیصلہ خود کرے۔ اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں خلیفہ یا عمال حکومت کے براہ راست (جمہوری طریق کے مطابق) انتخاب کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جس سے اس سلسلہ میں کسی انتخابی اصول کی وضاحت ہوتی ہو، تاہم بیعت عامہ کے ذریعے مسلمانوں کی اکثریت کی تائید کا نظام موجود ہے۔ لہٰذادورِ جدیدمیں ایسا طریق کار وضع کیا جا سکتا ہے جو اسلام کے مجموعی نظام کی مناسبت سے درست بھی ہوا ور حالات و ضروریات سے مطابقت بھی رکھتا ہو!

خلیفہ وقت کی طرف سے عمال حکومت اور خود آئندہ خلیفہ کی نامزدگی کی مثالیں موجود ہیں تاہم ایسی نامزدگی کے ساتھ عام مسلمانوں کی رضاکارانہ تائید کو ضروری سمجھا گیا۔ جیسا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کی خلافت کے سلسلہ میں ہوا اور آپؓ نے عمال کی تبدیلیاں عام مسلمانوں کی رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے کیں۔

خلافت اسلامی نے مسلم اکثریت کی رائے اور تائید کے حصول کے لیے ایک منفرد نوعیت کا ادارہ تشکیل دیا جو 'بیعت' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اس رضاکارانہ معاہدہ کا نام ہے جو حاکم و محکوم کے درمیان اس بنیاد پر قرار پاتا ہے کہ حاکم اللہ کے دین کو نافذ کرے گا اور محکوم اسے تسلیم کرے گا۔ خلافت کے انعقاد میں یہ شرط لازم ہے اور اس کے بغیر کوئی فرد خلیفہ قرار ہی نہیں پا سکتا۔

جدید جمہوری نظام میں ووٹ کے طریق کار کو عوام الناس کی رضا مندی کے حوالے سے 'بیعت' کے ادارہ سے مشابہت دی جاتی ہے مگر بغور مطالعہ اور تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے مقاصد اور طریق کار میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ جمہوری ریاست میں ہر شہری اقتدار کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ کسی دوسرے فرد یعنی نمائندے کو وہ اقتدار کا اپنا حصہ ووٹ کی صورت میں دیتا ہے تاکہ وہ منتخب ہونے والا نمائندہ اس کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ اس چیز کو وہ اپنا 'حق' سمجھتا ہے اور خالص اپنی مرضی سے اس کا فیصلہ کرتا ہے...... اگرچہ دور جدید میں یہ بات محلِ نظر ہے کہ آیا کہ وہ اس کی ''اپنی'' مرضی ہوتی ہے یا اپنی خواہشات کی مجبوری، جسے موجودہ دور میں انتخاب کے نظام، ذرائع ابلاغ کے پراپیگنڈے اور جذباتی یا معاشی بلیک میلنگ کے ذریعے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

نظام خلافت میں بیعت کرنے والے کا تصور اس سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ وہ اسے اپنا حق نہیں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ اقتدار کو اپنی ملکیت نہیں اللہ کی ملکیت اور اپنے پاس امانت سمجھتا ہے۔ تمام شہری اپنی اس امانت کو اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کرنے کا عہد لیتے

ہوئے، سربراہ مملکت یعنی 'خلیفہ' کے ہاتھ سونپتے ہیں اور اس سلسلہ میں اس کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں۔ اسلامی اصول سیاست میں خلیفہ اور رعایا کا تعلق اطاعت فی المعروف اور تعاون علی البر کی بنیاد پر بیعت کے ذریعے استوار ہوتا ہے جبکہ جمہوری ریاست میں ووٹ دینے والے اور لینے والے کا تعلق ایک محسن اور ممنون کا ہوتا ہے، اطاعت وغیرہ کا کوئی تصور کار فرما نہیں ہوتا۔ ووٹ کا تعلق دنیا کی سیاست اور مفادات تک محدود ہوتا ہے جب کہ بیعت دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی سے وابستہ ہے۔

ان دونوں کے طریق کار میں ایک اور نمایاں فرق ہے کہ ووٹ مانگا جاتا ہے اور ووٹ لینے والا اپنے آپ کو نمائندگی کے لیے خود پیش کرتا ہے جبکہ خلافت کی بیعت میں یہ دونوں عناصر نہ صرف یہ کہ شامل نہیں ہوتے بلکہ ممنوع ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ بیعت کا معاہدہ، سرعام، علی الاعلان ہوتا ہے جبکہ ووٹ خفیہ رائے دہی کے اصول پر دیا جاتا ہے، ان حوالوں سے دیکھا جائے تو ان دونوں کے اصول ومقاصد، طریقِ کار اور اثرات یا مضمرات (Implications) کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔

حواشی

۱۔ اسی مناسبت سے چرواہے کو بھی ابتداء میں سوس کہا گیا۔ یہ لفظ ابتداء میں گلہ بانی کے لیے استعمال ہوا اور بعد میں جہاں بانی کے معانی تک وسیع ہو گیا۔ اسی سے سائیس نکلا ہے جس کے معنی سرداری و راہنمائی کے ہیں۔ ہمارے ہاں یہی لفظ گلہ بانی و چوبانی کے معنوں میں 'سیس' یا 'سائس' کے طور پر مستعمل ہے۔
ابن منظور، لسان العرب (بیروت۔۱۹۵۶ء): ۱۰۸/۶، مرتضی زبیدی، تاج العروس (بیروت۔۱۹۹۴ء): ۱۶۹/۴

۲۔ الحج: ۴۱، النور: ۵۵، النساء: ۵۸

۳۔ احیاء علوم الدین (مصطفی البابی، مصر۔۱۹۳۹ء): ۹/۱، مقدمہ (منشورات، بیروت): ۱۱۳

۴۔ Soltau, *An Introduction To Politics* (Longman, London-1968): 2

۵۔ ابن منظور، ایضاً: ۱۴۹/۴، مرتضی زبیدی، ایضاً: ۲۱۵/۱۰
فیروز آبادی لکھتے ہیں: و جمهره، جمعه و القبر جمع علیه التراب و لم یطینه. گویا جمہر کا بنیادی معنیٰ ہوا کسی چیز کا جمع ہونا یا اکثریت میں ہونا۔ اسی سے لفظ جمہور ترکیب پاتا ہے۔ اس لفظ کا دوسرا معنی، نمایاں اور ممتاز ہونا کے ہیں: (الجمهور) بالضم، الرملة المشرفة علی حولها ۔
القاموس (مصر۔۱۹۵۲ء): ۳۹۳/۱،
اسی طرح تفصیل دیکھیے: المعجم الوسیط (بیروت) : ۱۳۷، البستانی، محیط المحیط (بیروت۔۱۹۷۰ء) :۱۲۶، لوئیس معلوف، المنجد (بیروت۔۱۹۵۱ء): ۹۹

۶۔ David Held, *Modesl of Democracry* (Cambridge-1987):1,2

۶۔ اسی طرح لفظ ڈیماکریسی کی لغوی تشریح کرتے ہوئے جیمز میکریگر نے لکھا ہے کہ:

The word democratic is derived from two Greek roots, demos... the people and kratos....... authority, and in its political sense, democracy means government by the poeple ..The many ...as contrasted with government by the one... the monarch, the dictator... or by the few..

رہا یہ سوال کہ یہ لفظ سیاسی اصطلاح کے طور پر کب سے اور کیسے مستعمل ہوا؟ اسکے جواب میں مذکورہ مصنف رقم طراز ہیں:

The word came into English usage in the seventeenth century to denote to direct democracy, the kind of government that existed in Athens and other Greek city-states.

- James Macgregor,Jack Walter, *Government by the People* (New York-1953) p:33,34.

۷۔ Michael Stewert, *Modern Forms of Government* (London-1959): 56

۸۔ Noberto Bobio, *Democracy And Dictatorship,* (Tr. Peter Kenealy, Polity Press-1997):140

۹۔ الانعام: ۱۱۶، اسی طرح ملاحظہ ہو سورہ المائدہ: ۷۷،

۱۰۔ الانعام: ۶، الحج: ۴۵

۱۱۔ البقرۃ: ۳۰، یوسف: ۴۳، یونس: ۱۰۹، المائدہ: ۴۲، البقرۃ: ۱۲۴، الکہف: ۸۳ تا ۹۸، البقرۃ: ۲۴۷، النمل: ۲۳ تا ۴۴،

۱۲۔ ص: ۱۲، النمل:۴۳،

۱۳۔ البقرۃ: ۳۰، ۳۶

لفظ خلیفہ کے معانی کے لیے دیکھیے: راغب اصفہانی، المفردات (دارالفکر، بیروت۔۱۴۰۴ھ): ۱۵۵، ۱۵۶

۱۴۔ ص: ۲۶

۱۵۔ ابن منظور، لسان العرب: ۷۹/۵، روحی بعلبکی، المورد (بیروت، سن ن م): ۵۵۶، ۱۲۴۷،

۱۶۔ Andrew Vincent, Theories of the State (Oxford-1976) :16

۱۷۔ Ernest Barker, Greek Political Theory(London-1967) :70

۱۸۔ Edward Mccheseny, Masters Of Political Thought (London-1947): 27

۱۹۔ Soltau, An Introduction To Politics:169

۲۰۔ یوسف: ۴۰

۲۱۔ العلق: ۶ تا ۹

۲۲۔ النحل: ۳۶، اسی طرح ملاحظہ ہو آیت:

فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باالله فقداستمسك بالعروة الوثقیٰ لا انفصام لها والله سمیع علیم.

(البقرہ۲۵۶) 'پس جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ ہی (کی حاکمیت) پر ایمان لائے اس نے اپنے آپ کو مضبوط سہارے سے جوڑلیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سنتا بھی اور جانتا بھی ہے!'

مولانا مودودی اسکی تفسیر میں لکھتے ہیں: طاغوت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے بندہ اپنی حد بندگی سے آگے نکل جائے، خواہ اس کی پرستش کی جائے یا اتباع اور اطاعت ، ہر قوم کا طاغوت وہ ہے جس کے پاس وہ فیصلہ کرانے کے لئے اپنے معاملات لے جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے مقابلہ میں۔ سید مودودیؒ ، تفہیم القرآن: ۱/۳۶۷

۲۳۔ الفرقان: ۲، الاعراف: ۵۴، الملک: ۱، الاسرآ: ۸۰، آل عمران: ۲۶

۲۴۔ الانعام: ۱۶۵، فاطر: ۳۹،

۲۵۔ الطبری، جامع البیان، مصطفیٰ البابی، مصر۔ ۱۹۶۷ء ج ۱/ص ۱۹۸۔ ابن الجوزی، عبدالرحمٰن، زاد المسیر ، مکتب الاسلامی، بیروت۔۱۹۶۴ء، ج۱/ص۶۰۔ الزمخشری، محمود بن عمر، الکشاف، مطبعۃ الاستقامۃ، مصر۔ ۱۹۴۶ء، ج۱/ص۲۹، ۸۹/۴۔ الرازی، فخرالدین، تفسیر الکبیر، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۰ء ،ج ۱/ص۱۵۲

۲۶۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن: ۱/۲۶، سید مودودی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔ ۱۹۹۱ء، ج۱/ص۶۲

۲۷۔ تفصیل کیلیئے ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، ۱۵واں ایڈیشن ۱۹۹۰ء، صفحات ۵۶۷ تا ۵۶۸

۲۸۔ ارسطو کے سیاسی افکار، آئین و دستور کی بھرپور وضاحت اور پرزور اہمیت پر مبنی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

- Aristotle, *Politics* (Translated by Benjamine Jowett) New York- 1943 (Book:II, IV)

۲۹۔ حمورابی کے قوانین وہ قدیم ترین تحریری دستور ہے جو جزوی طور پر تاریخ میں محفوظ ہے۔ پتھر کی سلوں پر تحریر یہ قوائد، تین حصوں اور ۴۹ کالموں کی صورت میں تحریر ہیں۔ یہ تحریر قوانین کی تفصیل، جرائم کی سزا کیساتھ ساتھ، دستور کی عظمت و اہمیت کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ تفصیل کیلیئے دیکھیے:

- Joan Oates, *Babylon*, Thomas & Hudson (London-1979): 74-75.

۳۰۔ الاعراف: ۱۴۶، الحج: ۶۷، المائدہ: ۴۸

۳۱۔ لوئس معلوف، المنجد : ۲۳۸

۳۲۔ الفاتحۃ: ۳، آل عمران: ۱۹، ۸۵،

مذہب کے درج ذیل مترادفات،قرآن میں آئے ہیں:**صراط ، طریقه، سبیل ، منسك،شریعه یا شرعه** اور **منهاج**...... الفاتحۃ: ۶، الاحقاف: ۳۰، الاعراف: ۱۴۶، الحج: ۶۷، المائدہ: ۴۸

ان الفاظ کی تفصیلی تشریح کے لیے دیکھیے: سید مودودی، تفہیم القرآن: ۱/۴۷۷، ۲/ ۷۹، ۳/۲۴۹، شاہ عبدالقادر، ترجمۃ القرآن: ۲، ۱۰۵، ۱۵۲، ۳۰۵، ۳۵۳

۳۳۔ ابن سعد، طبقات (دارالفکر، بیروت۔۱۹۹۴ء): ۱(II) /۷۲، یہ عبارت ڈاکٹر حمید اللہ کی فراہم کردہ معلومات سے

ماخوذ ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر حمیداللہ، عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی (اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔۱۹۸۷ء): ۸۱، ۷۵ تا ۹۶

۳۴۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ: ''یہ لفظ عربی ذہن میں چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے۔ غلبہ و تسلط، کسی ذی اقتدار کی طرف سے۔ اطاعت، تعبّد اور بندگی، صاحبِ اقتدار کے آگے جھک جانے والی کی طرف سے۔ قاعدہ ضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے۔ محاسبہ، فیصلہ اور جزا و سزا۔''
سید مودودی، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات (اسلامک پبلیکیشنز، لاهور۔۱۹۹۰ء):124، 132

۳۵۔ Ronald Jhonstone, *Religion And Society*(London-1987):13-20

۳۶۔ Heywood, *Political Ideologies* (London-1998):295

۳۷۔ *Ibid,* p - 296,

۳۸۔ *Ibid*, The term 'liberal' has been in use in since the fourteenth century but has had a wide variety of meanings.
The latin liber referred a class of free men, in other words, men who were neither serfs nor slaves. p: 24

۳۹۔ Rger Eatwell, *Contemporary Political Ideologies* (New York-1993): 24

۴۰۔ Philip Hammona Heywood, *Ibid,* p - 295,

۴۱۔ *The Sacred In A Secular Age* (California-1985) :36

۴۲۔ الاعراف: ۵۴، یوسف: ۴۰، الانعام: ۵۷، ۱۱۴-۱۱۶ (ساتھ ہی ملاحظہ ہوں، آیات: النساء: ۶۴، ۶۵،۶۹،۸۰، الشوریٰ: ۳۸، النساء: ۵۸، ۵۹)

۴۳۔ النساء: ۵۹، النور: ۵۵، الحج: ۴۱

۴۴۔ ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیہ (دارالدعوۃ الاسلامیہ، لاہور) : ۱۶۱

۴۵۔ آل عمران: ۱۵۹، الحج: ۴۱، المائدہ: ۴۴ تا ۴۷، الحدید: ۲۵

۴۶۔ Andrew Heywood, *Political Ideologies* : 152

۴۷،۴۸۔ Heywood, *Political Ideas And Concepts* : 57

۴۹۔ Heywood, *Political Ideas And Concepts:* 71

۵۰۔ *Politicial Ideologies:* 152

۵۱۔ *Ibid,* p-153, 51.*Ibid,* p-15

۵۲۔ راغب اصفہانی، مفردات: ۶۱، الحجرات: ۱۱، ۱۳، البقرۃ: ۷۵، ۸۵ الحجر: ۱۰

۵۳۔ الانعام: ۹۹، اسی طرح سے دیگر مثالیں: البقرۃ: ۲۶۴، الاعراف: ۶۹،۱۲۷، ھود: ۷۰، الاعراف: ۱۳۸، التوبہ: ۱۷، الحج: ۷۸،یوسف:۳۷، الاعراف: ۱۵۹، البقرۃ: ۲۱۳، آل عمران:۱۰۴، ۱۱۰

۵۴۔ النساء: ۱، الحجرات: ۱۳، ملاحظہ ہوں آیات: القصص: ۴، الانعام: ۱۵۳، آل عمران: ۱۰۵

۵۵۔ سید سلیمان ندویؒ، ارض القرآن (معارف پریس اعظم گڑھ۔۱۹۵۶ء) : ۱۰۶/۲

۵۶-۵۷۔ Soltau, *An Introduction To Politics:* 179

۵۸۔ آل عمران: ۱۵۹، النساء: ۵۹

دیگر تفصیل کے لیے دیکھیں: البلاذری، فتوح البلدان (نفیس اکیڈمی، کراچی۔۱۹۸۶ء) : ۲۷۶

۵۹۔ گوہر الرحمٰن، اسلامی سیاست (المنار، لاہور۔۱۹۹۵ء): ۳۰۰،

۶۰۔ سنن ابوداؤد (بیروت۔۱۹۸۱ء): ۳۴۸/۳، لسان العرب: ۲۳۸/۹

۶۱۔ المائدہ: ۱۲

۶۲۔ الاعراف: ۱۰۹، النمل: ۳۲، النساء: ۵۹، ۸۳

۶۳۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن (دارالکتب عربیہ، مصر۔ ۱۹۶۷ء): ۲۶۰/۵،

فخرالدین رازی، تفسیرالکبیر: ۱۴۴/۱۰، الماوردی، الاحکام السلطانیہ (مصر۔۱۹۶۰ء): ۶

۶۴۔ الزمر: ۹، الانعام: ۵۰، المائدہ: ۱۰۰، الانعام: ۱۱۶

۶۵۔ الحدید: ۱۹، البقرۃ: ۴ تا۱۰، الاعراف: ۳۵

۶۶۔ الماوردی، ایضاً، ابن منظور، لسان العرب: ۱۴۹/۴

☆☆☆☆☆